© rasailojaraid.com

قسط نمبر 1

گاہے گاہے باز خواں

ظفر حسین ایبک

انقلابی سفر کی کہانی

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر کی آزادی کے لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر گیارہ سال تک افغانستان، روس اور ترکی میں گذارے۔ اس عرصہ میں جناب ظفر حسین ایبک مرحوم بھی آپ کے ساتھ رہے۔انہوں نے اس دور کے واقعات اور مناظر کو جس طرح دیکھا اس کو قلمبند کیا۔ یہ انقلابی داستان آپ پڑھ کر آج کے حالات میں رہنمائی حاصل کریں۔ (ادارہ)

پیدائش دہلی سے 76 میل اور پانی پت کے مشہور میدان جنگ سے تقریباً 25 میل شمال میں شہر کرنال واقع ہے، اس کے محلہ قاضیاں میں ایک چھوٹے سے زمیندار کا سہ منزلہ پختہ مکان تھا۔ آس پاس ان کے دوسرے ارائیں رشتہ داروں کے ایک منزلے، دو منزلے اور بعض تین منزلے گھر تھے۔ یہ مکان میرے والد صاحب مرحوم حافظ عظیم الدین صاحب کا آبائی گھر تھا۔ وہ اپنے رشتہ داروں میں نسبتاً زیادہ اچھی حیثیت رکھتے تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مثلاً ہمارے محلے کی مسجد میں باوجود مسجد کا امام اور حافظ موجود ہونے کے جب کبھی والد صاحب مرحوم اپنی نوکری کے دورے سے فارغ ہوکر کرنال واپس آتے اور شام کی نماز کے لئے مسجد کو جاتے تو لوگ امامت کے لئے انہی کو آگے بڑھادیا کرتے تھے اور جمعہ کے دن انہی سے خطبہ پڑھنے اور نماز پڑھانے کی درخواست کیا کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم اپنے والد کی زندگی میں کھیتی باڑی کا کام چھوڑ کر بغرض تعلیم بلا اطلاع دیوبند چلے گئے تھے کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آکر بلا اطلاع بھوپال چلے گئے تھے۔ اس زمانہ میں ملک میں ریل وغیرہ تو زیادہ نہ تھی، اس لئے ان کو اس سفر میں کافی تکلیفیں پہنچیں۔ وہاں انہوں نے قرآن شریف حفظ کیا اور اس زمانے میں مسلمانوں میں جتنی تعلیم کا رواج تھا اس کو حاصل کیا اور وہیں ملازمت اختیار کرلی۔ وہ وہاں اتنی مدت رہے کہ ان کے والدین ان کی زندگی سے مایوس ہوگئے ان کی والدہ کی بینائی ان کی فراق میں روتے روتے کم ہوگئی تھی۔ وہ جب واپس آئے تو ان کی والدہ نے ان کو دیکھ کر (میری والدہ صاحبہ کی روایت کے مطابق) یہ کہا ''بیٹا! خدا کرے تم بھی اپنی اولاد کی وجہ سے اسی طرح بلکتے رہو جس طرح میں تمہارے لئے تڑپتی رہی ہوں۔'' خدا کی شان کہ آگے چل کر والد صاحب مرحوم کو میری جدائی کا داغ لگا اور مجھے دوبارہ دیکھے بغیر میری یاد میں تڑپتے تڑپتے فوت ہوگئے۔

والد صاحب نے بھوپال سے واپس آکر کھیتی باڑی چھوڑ دی اور اپنی زمین کاشت پر دے کر خود سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد صدیق مرحوم کو بھی ملازمت دلوادی تھی اور وہ قانون گو بن گئے تھے۔

میں 26 ستمبر 1895ء کی رات کو پیدا ہوا۔ والدہ صاحبہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ اس رات سخت بارش ہورہی تھی۔ ان کے قول کے مطابق میں پیدائش کے وقت بہت ہی کمزور تھا یہاں تک کہ میری زبان سوکھی ہوئی اور تالو کو چمٹی ہوئی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دایہ کو پہلے تو یہ خیال آیا کہ میری زبان ہی نہیں ہے، لیکن بعد میں جب تالو سے چپٹی ہوئی دیکھی تو اسے چھوارے کے شربت سے نرم کرکے تالو سے جدا کیا۔ کہتے ہیں کہ میں اتنا کمزور تھا کہ کبھی میں روتا تو میری آواز ساتھ والے کمرے میں بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ غالباً اس پیدائشی کمزوری کی وجہ سے میں ساری عمر نہیں پنپا اور اپنے ہم عمر لڑکوں کی نسبت میرا جسم ذرا چھوٹا تھا۔

میرے والد کے پانچ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے میری بڑی بہن نعمت بی بی اور بڑے بھائی محمود حسن اور میں زندہ رہے۔ بھائی صاحب والدین کی پہلی اولاد نرینہ ہونے کی وجہ سے والد صاحب کے بڑی لاڈلے تھے۔ میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے والدہ صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ کا پیارا تھا۔

ہمارے اس وقت کے دستور کے مطابق، میں چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہوا تو مجھے ارائیوں کے محلے کی مسجد میں قرآن شریف کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمشیرہ صاحبہ مرحومہ مجھے مسجد لے گئیں اور حافظ جی کے سپرد کرآئیں لیکن میں وہاں سے دو گھنٹے کے بعد ہی بغیر کسی سے اجازت لیے نکل کر گھر آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل وہاں تنگ آیا اور میں سبق سے بھاگ نکلا تھا۔ لیکن تعلیم سے یہ میرا ساری عمر میں پہلا اور سب سے آخری فرار تھا۔ دوسرے دن پھر مجھے ہمشیرہ صاحبہ مسجد لے گئیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل ایسا لگا اور حافظ جی مجھے ایسے پیار سے پڑھانے لگے کہ میں ان کا معتمد بھی بن گیا۔ ان کو محلے کے گھروں سے جو کھانا آیا کرتا تھا ان کی نگرانی انہوں نے میرے ذمہ لگادی تھی۔ میں نے پہلا قاعدہ اور عم کا سپارہ اس مسجد میں ختم کیا۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم نے مجھے ایک نجی مدرسہ میں جو حفظ قرآن کے لئے تھا، داخل کرادیا۔ وہاں میں نے چند سپارے حفظ کئے لیکن ایک روز جب حافظ جی نے مجھ سے دور لیا تو میں زبانی قرآن شریف نہ سنا سکا جس پر مجھے کان پکڑوائے گئے اور وہی سپارے پھر دوبارہ حفظ کرنے کو کہے گئے۔ میں نے چند دنوں میں دو سپارے حفظ کئے لیکن جب تیسرے سپارے کے حفظ کرنے کی نوبت آئی اور استاد نے پچھلے سبق سنے تو پھر زبانی نہ سنا سکا۔ والد صاحب کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ میرا حافظہ قرآن شریف حفظ کرنے کے قابل نہیں ہے اس لئے مجھے دینی درس گاہ سے اٹھا کر ایک مدرسہ میں جس کو ایک انجمن نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا ہوا تھا داخل کرادیا۔ تعجب ہے کہ والد صاحب مرحوم اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں کا حافظہ تو اتنا اچھا تھا کہ وہ سب کے سب حافظ قرآن تھے لیکن نہ میں اور نہ مجھ سے پہلے میرے بھائی محمود حسن صاحب قرآن حفظ کرسکے۔ میں اس نئے مدرسے میں کوئی ایک سال پڑھتا رہا اور یہاں سے پہلی جماعت پاس کی۔ لیکن چونکہ اساتذہ کچھ قابل نہ تھے والد صاحب مرحوم نے مجھے سرکاری ابتدائی اسکول میں، جو ذرا دور اور ہندوؤں کے محلے میں ایک بنئے کی حویلی میں تھا بھیج دیا۔ یہاں سے دوسری جماعت میں، جس میں ہندو اور مسلمان طلبہ ملے جلے پڑھتے تھے لیکن استاد مسلمان تھے۔ میں اچھے نمبر لینے لگا اور جماعت کا مانیٹر مقرر ہوگیا۔ لیکن سالانہ امتحان میں مجھے حساب کے سوال حل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی حالانکہ میں اس مضمون میں اپنے ہم جماعت کو اکٹھا کرکے ان کو پہاڑے کہلایا کرتا تھا۔ اس ناکامی سے مجھے بہت رنج ہوا لیکن تیسری جماعت میں، میں نے اس کی تلافی کرلی اور وہاں سے پاس ہوکر کرنال ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوگیا۔ اس زمانے میں مسلمان کاشتکاروں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مفت ملتی تھی مگر دوسرے لڑکے فیس دیا کرتے تھے ان کے باوجود بھی ہماری برادری میں سے صرف پانچ چھ بچے اسکول جایا کرتے تھے۔ ان کے سوا کسی اور نے نہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق ظاہر کیا اور نہ ان کے والدین نے کوئی ایسی آرزو دکھلائی! اس میں، میں ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کو قدرے معذور بھی سمجھتا ہوں کیوں کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ کھیت میں لے جاتے اور وہاں ان سے کام لیا کرتے تھے۔ جماعت میں ہندولڑکے کثرت سے تھے۔

مسلمان جن کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ (ترجمہ:) گہوارے سے لے کر قبر میں جانے تک علم کے حاصل کرنے میں لگے رہو، اس زمانے میں بھی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ چوتھی جماعت میں، میں سب مضامین میں اچھا تھا لیکن سالانہ امتحان میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ جب انگریزی خوش خطی کی کاپی مجھ سے مانگی گئی اور کہا گیا کہ سب سے اچھا لکھا ہوا صفحہ دکھلاؤ تو میں نے کسی عبارت والے صفحے کے بجائے اس آخری صفحے کو دکھلایا جس پر صرف عدد لکھے ہوئے تھے۔ اس پر انسپکٹر نے میرے انگریزی کے نمبر کاٹ دیئے اور میں چوتھی جماعت سے پانچویں جماعت میں پاس ہوکر چڑھنے کی بجائے تین ماہ کی ترقی پر پانچویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس پر مجھے بہت شرم آئی۔ بھائی صاحب نے مجھے انگریزی پڑھانا شروع کیا اور اس پر خاص زور ڈالا۔ رات کو دوسرے روز کے سبق کے سارے نئے مشکل الفاظ ڈکشنری سے تلاش کرا کے کاپی میں نوٹ کرانے اور چھٹی کے دنوں میں سارے الفاظ کو مجھے زبانی یاد کرانے لگے۔ دوسرے سبقوں میں تو میں تھا ہی اچھا، اس لئے پانچویں جماعت کے سالانہ امتحان میں دوم نمبر پر آیا اور اس طرح مجھے تین سال کے لئے تین روپے ماہوار وظیفہ مل گیا۔ جس سے تین سال کے لئے میری تعلیم کا خرچ نکل آیا اور میں اپنے والدین پر تعلیم کے خرچ کے لحاظ سے بار نہیں بنا۔

ہمارے زمانے میں ابتدائی اسکول کی چوتھی اور پانچویں جماعتوں میں فارسی زبان لازمی تھی لیکن ہم نے جو کچھ فارسی، اسکول کی کتابوں سے پڑھی اور سیکھی وہ (آب زر=سونے کا پانی) اور (نان گرم =گرم روٹی) جیسے آسان فقروں سے زیادہ آگے نہ گئی اور فارسی بولنے کی ہم میں کبھی بھی ہندوستان میں رہتے ہوئے قابلیت پیدا نہ ہوئی۔ جب مجھے آگے چل کر کابل جانا پڑا تو وہاں فارسی زبان میں گفتگو کے لحاظ سے بالکل جاہل ہی نکلا۔ ہم نے پانچویں جماعت میں فارسی کی صرف ونحو اور گلستان وبوستان سے بعض انتخابات پڑھے۔ سعدی کی حکمت آمیز کہانیوں اور نصیحتوں سے فائدہ اٹھایا۔ مثلاً ان کا یہ شعر:

نیم نانے گر خورد مرد خدا
بذل درویشان کند نیم دیگر

(مرد خدا وہی ہے جو اگر آدھی روٹی خود کھائے تو آدھی روٹی فقیر کو دیدے)

آگے چل کر میری ساری زندگی کا دستور العمل بنا رہا۔

نیز ان کا ایک قول ہے:

''از حکیمے پرسید ند ادب از کجا آموختی؟ گفت از بے ادبان! گفتند چہ طور؟ گفت ہر چہ آنہا کردند من از آں حذر نمودم۔'' یعنی ایک عقلمند سے پوچھا گیا کہ آپ نے ادب کہاں سے سیکھا؟ تو اس نے جواب دیا کہ ''بے ادبوں سے۔'' کہا گیا: ''یہ کیسے؟'' تو اس نے جواب دیا ''بے ادبوں نے جو کچھ کیا میں نے اس سے پہلو تہی برتی اور اس سے اپنے آپ کو بچایا۔''

یہ حکمت آمیز قول بھی میری زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا اور میں ہمیشہ ناکارہ لوگوں کی صحبت سے دور رہا۔ مڈل اسکول میں عربی اور فارسی زبانوں میں سے ایک زبان انتخاب کرنا پڑتی تھی۔ میں نے عربی لے لی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اردو زبان میں جو عربی الفاظ تھے، ان کو سمجھنا آسان ہوگیا اور جب کابل پہنچ کر استاد مرحوم مولانا عبید اللہ سندھی صاحب سے تفسیر قرآن شریف پڑھی تو کلام الٰہی کے سمجھنے میں اس سے مدد ملی۔ عربی کتابوں میں جو ضرب الامثال اور نصیحت آمیز فقرے پڑھے ان کا بھی میرے کیرکٹر اور عادتوں پر بہت اثر پڑا۔ مثلاً ایک نصیحت آمیز فقرے کا ترجمہ تھا: ''انسان کے لیے زیادہ کھانا کھانے کی وجہ سے بیمار ہوجانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑی شرم کی بات ہے۔"
اسی ذیل میں والد مرحوم نے مجھے بتلایا کہ آنحضرت ﷺ اپنی ضرورت سے چند ایک لقمے کم کھا کر دسترخوان سے اٹھ جایا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کا میری طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ کبھی بھی میں نے زیادہ کھانا نہ کھایا اور اس وجہ سے مجھے بدہضمی کی شکایت کبھی بھی نہیں ہوئی اور نہ ہی موٹاپے سے جو بیماریاں پیدا ہوا کرتی ہیں، کبھی ان کا منہ دیکھا۔ ہاں سے میرا بدن ہمیشہ دبلا تو ضرور رہا لیکن چستی اور مستعدی میں اور مشکلیں جھیلنے میں، میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

والد صاحب مرحوم تہجد کی نماز کے بعد قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے، صبح کی نماز کے لئے مجھے بھی جگاتے اور اپنے ساتھ مسجد میں لے جایا کرتے تھے اور واپسی پر ہر روز آدھا سپارہ تلاوت کرادیتے تھے۔ اس طرح میں نے سارا قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا تھا۔ والدہ مرحومہ بھی نماز اور روزے کی پابند تھیں۔ یہاں تک کہ اگر بیماری یا تھکن کی وجہ سے کھڑی ہوکر نماز نہ ادا کرسکتیں تو بیٹھ کر ضرور پڑھ لیتی تھیں۔ گھر میں مذہبی اصولوں کی پابندی کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں کرنال اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کے پاس جو مسلمان معلموں نے نماز کے لئے ایک چبوترہ بنا رکھا تھا وہاں ظہر اور عصر کی نماز کے لئے ضرور جایا کرتا تھا۔ چند ایک اور مسلمان طالب علم بھی باقاعدہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں ہم نے یہ چبوترہ پختہ بنا لیا تھا۔ اس پر آریہ سماجی ہندو طالب علموں نے بھی اس کے پاس ہی ایک چبوترہ بنا کر پوجا شروع کردی تھی۔ ہندو اور مسلمان لڑکوں میں اس بارے میں ایک رقابت سی تھی مگر اس سے کبھی تفرقہ یا جھگڑے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

میری چھٹی جماعت کے بعد ہمارے گھرانے کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ بھائی صاحب انٹرنس کے بعد مہندرا کالج پٹیالہ میں داخل ہوگئے تھے اور ان کی فیس اور پڑھائی کا خرچہ بڑھ گیا تھا۔ والد صاحب مرحوم اس زمانے میں سن رسیدگی کی وجہ سے سرکاری نوکری سے جدا ہوچکے تھے۔ اس دور میں پنشن کا بھی کوئی انتظام نہ تھا ان کو نئی ملازمت کی تلاش میں دقتیں پیش آئیں۔ آخر کار نواب دوجانہ کے ہاں اہلکار بن گئے۔ لیکن اس ملازمت کی تنخواہ سے بہ مشکل بھائی صاحب کی تعلیم کا خرچہ پورا ہوا کرتا تھا۔ بھائی صاحب کی چار سالہ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانے میں مجھے پالنے کے لئے میرے والدین، خاص کر والدہ صاحبہ مرحومہ نے جو قربانیاں دیں، ان کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ مجھے ہمیشہ یہی قلق رہا کہ میں جوانی میں ہندوستان سے جدا ہونے کی وجہ سے ان کی کوئی خدمت نہ کرسکا اور بھائی صاحب کے سر پر چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ والدہ صاحبہ خود روکھی سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کرتیں لیکن میرے لئے دودھ اور بالائی ضرور مہیا کرتی رہیں۔ بنئے کی دکان سے خرید وفروخت گھٹانے کے لئے گھر میں خود ہی آٹا پیس لیا کرتی تھیں۔ صبح کے کام سے فارغ ہوکر چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ دوپہر کے بعد اوڑھنی پر کشیدہ نکالنا، سوزن کاری کا کام کرنا اور اس طرح ضروری کپڑوں کو گھر میں خود ہی تیار کرنا ان کا روز مرہ کا مشغلہ تھا۔
رات کو مطالعہ کرنے کے لیے ہم میں لیمپ جلانے کی مالی طاقت نہ تھی اور میں سرسوں کے تیل کے چراغ کے سامنے بیٹھ کر سبق یاد کیا کرتا تھا۔ اس سے میری بینائی کو چھوٹی عمر ہی میں کچھ نقصان پہنچ گیا۔
والد صاحب مرحوم نے دو سال تک تو بھائی صاحب کی تعلیم کا خرچ پورا کیا لیکن آخر کار دیکھا کہ وہ اپنی تنخواہ سے یہ کام سرانجام نہ دے سکیں گے۔ اس پر انہوں نے ہمارے رشتہ داروں میں سے وکیل خان بہادر مولوی عبدالغنی صاحب سے قرض مانگا۔ انہوں نے قرض کے بجائے اس شرط پر بھائی صاحب کی تعلیم اپنے ذمہ لے لی کہ تعلیم کے بعد بھائی صاحب جب نوکری حاصل کرلیں تو وہ اپنی برادری کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوجوانوں کو اپنے خرچہ پر تعلیم دلوایا کریں۔ والد صاحب مرحوم نے یہ شرط منظور کی اور بھائی صاحب نے بھی اس شرط کو پورا کرنے کا ذمہ لیا۔ چنانچہ وہ نوکری ہونے کے بعد ہمیشہ کئی مسلمان جوانوں کی تعلیم کا خرچہ دیتے رہے۔ ساتویں جماعت میں مجھے سردی لگی اور بخار آنے لگا۔ سالانہ امتحان میں مجھے اپنی جماعت میں اول نمبر آنے کی ضرورت تھی اس لئے بخار کی حالت میں بھی امتحان کے لئے اسکول جاتا رہا۔ لیکن اردو کے امتحان کے دن بخار اتنا زیادہ چڑھا کہ اس روز اسکول جانے کے باوجود بھی بخار کی وجہ سے امتحان نہ دے سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دو نمبروں کی کمی کی وجہ سے جماعت میں دوم رہا۔ اگر چہ اس سے میرے وظیفہ پر کوئی اثر نہ پڑا لیکن مجھے دوم ہونے پر افسوس ضرور ہوا۔ میں آٹھویں جماعت کے امتحان میں پھر اول نمبر نکل کر، دو سال کے لئے اور وظیفہ لینے میں کامیاب ہوگیا جس سے انٹرنس میں پڑھنا میرے لئے ممکن ہوا اور خاندان پر میری فیس کا بوجھ نہ پڑا۔

میں دسویں جماعت میں تھا کہ بھائی صاحب بی-اے پاس کر کے کرنال آئے اور وہاں ہائی اسکول میں انگریزی کے ٹیچر بن گئے۔ اس کے بعد خدا کے فضل سے ہماری مالی مشکلات حل ہوگئیں، انہوں نے انٹرنس کے امتحان کی تیاری میں میری مدد کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرا جگر اور زہرہ (پتا) کچھ خراب ہوگیا تھا جس سے مجھے یرقان کا مرض لاحق ہوا اور میرا سارا بدن زرد ہوگیا۔ یہی بیماری ایک زمانے میں بھائی صاحب کو بھی لگی تھی اس لئے ان کو جلد ہی میرے علاج کرانے کا خیال آگیا۔ اور میں سالانہ امتحان سے پہلے ہی شفایاب ہوگیا۔ کرنال ہائی اسکول کے لڑکے انٹرنس کے امتحان کے لئے انبالہ سینٹر میں جانے پر مجبور تھے۔ اس لئے میں بھی انبالہ گیا مگر بھائی صاحب میرے ساتھ گئے۔ خدا کے فضل سے میں نے امتحان اچھی طرح دیا اور 1911ء میں جب نتیجہ سنایا گیا تو میں اپنی جماعت میں اول نکلا۔ کچھ دنوں کے بعد یونیورسٹی سے خبر آئی کہ مجھے کالج میں دو سال پڑھنے کے لئے اسکالرشپ دیا گیا ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک بڑی خوشخبری تھی۔ بھائی صاحب مجھے لاہور لے گئے اور اسی سال گورنمنٹ کالج میں داخلہ کرادیا۔

گورنمنٹ کالج میں میرا داخلہ:

کالج میں وظیفہ خوار طالب علموں اور کوکواڈرینگل بورڈنگ ہاؤس میں علیحدہ علیحدہ کمرے جن کو کیوبی کل کہا جاتا تھا، دیئے گئے۔ باقی لڑکے ڈارمیٹری میں رہتے تھے۔ اس سے مجھے تندہی اور توجہ سے سبق یاد کرنے اور مطالعہ میں مصروف ہونے کا موقع ملا۔ فرسٹ ایئر کے مسلمان بورڈروں میں میرے ہم جماعت شیخ خوشی محمد بھی کیوبی کل میں رہا کرتے تھے۔

ہم دونوں سائنس فیکلٹی میں تھے اور دوست بھی بن گئے تھے۔ میرے متعلق والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحب کا یہی فیصلہ تھا کہ ایف ایس سی پاس کر کے میڈیکل کالج میں داخل ہوں۔ گورنمنٹ کالج میں مجھے ہمیشہ سے یہی تمنا تھی کہ جماعت میں اول رہوں اس لئے رات کو دیر تک مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا۔ لیمپ کو کھڑکی میں اونچی جگہ رکھ کر کھڑا ہوکر سبق یاد کیا کرتا تھا تاکہ نیند نہ آئے۔ اس کو کالج میں کچھ لوگ تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ دوسرے طالب علم خاص کر ہندو جن سے رقابت تھی، اس پر چیں بہ جبیں ہوتے۔ بڑی جماعتوں کے مسلمان طلبا دور سے سیر کیا کرتے تھے لیکن کسی کو جرات نہ تھی کہ مجھ پر نکتہ چینی کرے یا مجھے کہے کہ اس طرح میری طبیعت خراب ہوجائے گی۔ اس خیال سے کہ رات کو مجھے نیند جلد نہ آئے۔ میں شام کو کھانا بہت کم کھایا کرتا تھا لیکن اتوار کی رات کو بہت سویر سوجایا کرتا تھا اور اتوار کے دن صبح کو دیر سے اٹھتا تھا تاکہ بے خوابی کی ذرا تلافی ہوجائے۔ میں صبح کو ورزش کرنے اور فٹ بال گراؤنڈ میں دوڑ کر چکر لگانے کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عادی تھا۔ شام کو ہاکی بھی کھیلا کرتا تھا۔ میرے ہندو رقیب اس قسم کی ورزشوں اور کھیلوں کے شوقین نہ تھے۔ ایف ایس سی میں میری صحت اچھی رہی مگر چند ایک دفعہ لاہوری پھوڑا نکلا جو خون کی خرابی کی وجہ سے تھا ایف ایس سی کے امتحان یونیورسٹی اور بعد میں آرگینگ کیمسٹری کے امتحان میں جو میڈیکل کال کے داخلے کے لئے ضروری تھا میں اول نکلا۔ اس سے مجھے دو سال کے لئے پھر وظیفہ مل گیا۔ مگر یہ وظیفہ میڈیکل کالج کے لئے نہیں تھا اس لئے میں ڈاکٹر بننے کے خیال سے درگزر کرنے پر مجبور ہوا اس پر میرے گھرانے نے فیصلہ کیا کہ میں بی اے میں Mathematics اے وبی کورس لے کر انجینئرنگ کالج کی تیاری کروں۔

قومی جذبات کی نشوونما:

مجھے گورنمنٹ کالج آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ جنگ طرابلس شروع ہوگئی۔ اس کے بعد 1912ء میں جنگ بلقان ہوئی۔ مسلمانوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ ترکوں کی حمایت میں عام جلسے ہونے لگے۔ چندے جمع کیے جانے لگے تاکہ جنگ بلقان کے ترکی زخمیوں کی تیمارداری کے لئے ہلال احمر کا ایک وفد ترکی بھیجا جائے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ان جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ طرابلس کے شہیدوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اس نظم کا جس کا عنوان ''حضور رسالت مآب میں'' ہے، ہمارے دلوں پر بہت اثر ہوا۔

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اشعار کی میرے زمانے کے مسلمان طالب علموں کے خیالات کو قومی اور اسلامی نہج پر لانے میں بہت تاثیر ہوئی۔ کالج کے باغ کے کمپاؤنڈ میں مسلمان طالب علموں نے نماز کے لئے ایک چبوترہ بنالیا تھا اس کے نزدیک کسی بزرگ کی قبر تھی جس کا ایک متولی تھا۔ ہم صبح کی نماز اکثر جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ میں نماز فجر کے بعد اپنے ہم جماعت عبدالمجید خان مرحوم سے مسلمانوں کی عام حالت اور ترکوں کے بارے میں باتیں کرتا کرتا کواڈرینگل میں واپس آیا کرتا تھا۔ ظہر کی نماز میں شہر میں رہنے والے مسلمان طالب علموں میں سے عبدالرشید مرحوم سے بھی اس قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں خوشی محمد کا بھی ہم سے علیحدہ اسی قسم کا ایک حلقہ احباب تھا، جس میں ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں سے عبدالحمید، عبداللہ، شجاع اللہ اور غلام حسین شریک تھے۔ اس حلقے کے ساتھ عبدالمجید خان اور عبدالرشید کی نسبت میرا زیادہ تعلق تھا۔ جب بلقان کی خبریں اکثر بحث میں آیا کرتی تھیں اور ہم سب ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے، ہمارے اس زمانے کے قومی اور مذہبی خیالات کی نشوونما میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ اور مولانا ابوالکلام مرحوم کے ہفتہ وار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کا بہت اثر ہوا۔ انہی اخبارات کے مقالوں نے ہمیں ترکوں کا گرویدہ بنادیا تھا۔ انگریزوں کے برخلاف بھی ہمیں انہی تحریروں نے ابھارا اور ہم میں قومی جذبات بھی انہی جریدوں نے پیدا کیے۔

بلقان کی جنگ کے دنوں میں ایک دن بھائی صاحب جو اس وقت لاہور ٹریننگ کالج میں پڑھ رہے تھے مجھ سے ملنے کے لئے گورنمنٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس کواڈرینگل میں آئے۔ دوپہر کی گرمی کی وجہ سے انہوں نے پانی چاہا۔ میری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صراحی میں اس وقت پانی نہ تھا۔ میں خوشی محمد کے کمرے میں پانی لینے گیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی صراحی توڑ ڈالی ہے اور ماتم میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ بلغاریوں نے شہر اڈریانوپل Adrianople پر جس کو ترک ادرنہ (Edrine) کہتے ہیں اور جہاں ترکی کی سب سے بڑی اور سب سے خوبصورت مسجد سلیمیہ واقع ہے، قبضہ کرلیا ہے اور اس پر اظہار غم کے لئے انہوں نے اپنی صراحی توڑ ڈالی ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں واپس آ کر بھائی صاحب کو یہ بات سنائی تو وہ کہنے لگے کہ "ایسی حرکت بالکل بے وقوفی کے مترادف ہے کیوں کہ صراحی توڑنے سے ترکوں کو تو کوئی مدد نہیں مل سکتی صرف اپنا ہی نقصان ہے۔ اگر ان کی مدد کرنا ہے تو ضروری ہے کہ کچھ اور کام کیا جائے۔"

گورنمنٹ کالج میں آگ لگانے کا واقعہ:

کچھ دنوں بعد ترکوں نے اڈریانوپل پھر فتح کرلیا اور جنگ بلقان ختم ہوگئی۔ لیکن یورپ کی حکومتوں نے اور خاص کر انگریزوں نے صلح کی شرطوں میں مغلوب شدہ بلقانی قوموں کی ترکوں کے مقابلے کی طرفداری کی اور ان کی حمایت پر ڈٹ گئے۔ اس سے انگریزوں کے برخلاف مسلمان نوجوان طالب علموں میں اور بھی جذبات بھڑک اٹھے۔ خوشی محمد اور ان کے چند دوستوں نے جن میں ہمارا ہم جماعت شجاع اللہ بھی شریک تھا یہ سوچا کہ گورنمنٹ کالج کو آگ لگا کر انگریزوں سے انتقام لیں۔ مجھے ان کے اس منصوبے کا اس وقت علم نہ تھا۔ شجاع اللہ نے ایک رات کالج کے کلرک کی کھڑکی کا شیشہ مکا مار کر توڑا اور ان کے ساتھیوں نے کچھ مٹی کا تیل کمرے میں چھڑک کر مٹی کے تیل میں ڈوبے ہوئے جلتے چیتھڑوں کو اندر پھینکا اور کمرے کو جلانے کی کوشش کی لیکن آگ زیادہ نہ جلی اور کمرے کے کاغذات وغیرہ کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ کمرے کے شیشے کو مکا مار کر توڑنے کی وجہ سے شجاع اللہ کا ہاتھ زخمی ہوگیا۔ اس نے ہاتھ کا خون صاف کرنے کے لئے دیوار پر ہاتھ لگادیا جس سے اس کا پنجہ دیوار پر اتر آیا۔ اگلے دن تحقیقات شروع ہوئی۔ کالج کے اساتذہ کو شبہ ہوا کہ یہ آگ لگانے کا واقعہ اس مزار کے متولی کا کام ہے جہاں ہم کالج کے کمپاؤنڈ میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے انہی دنوں اس بیچارے کے ہاتھوں میں مزار کے اردگرد جھاڑیاں صاف کرتے ہوئے کہیں ایک کانٹا سا لگ گیا تھا جب پولیس نے اس کو پکڑا اور اس کے ہاتھ میں زخم دیکھا تو ان کو یقین ہوگیا کہ کالج کو آگ لگانے کی کوشش اس نے کی تھی اس لئے بے چارہ قید میں ڈال دیا گیا اگر چہ وہ اپنے کو بے گناہ ہی کہتا رہا۔

ہم مسلمان طالب علم جنہوں نے ایف ایس سی میں بوٹنی اور زوالوجی لی ہوئی تھی اکثر شام کو بوٹینکل گاڈرنز جولارنس گارڈن (اب باغ جناح) کے پرے تھے جایا کرتے تھے تاکہ وہاں سے مختلف قسم کے پودوں اور پھولوں کو دیکھیں اور نظری پڑھے ہوئے سبقوں کو عملی جامہ پہنائیں۔ ایک شام کو خوشی محمد نے جس کو میرے قومی جذبات کا علم تھا اس باغ سے واپسی کے وقت مجھے رازداری کا حلف لے کر کالج کی آگ کا واقعہ سنایا اور اعتراف کیا کہ آگ لگانے کی شجاع اللہ اور اس کے ساتھیوں نے کوشش کی تھی۔

کالج کے ذمہ دار جب متولی کو مجرم ثابت نہ کرسکے تو چند دن بعد ان کو کالج کے طالب علموں پر شبہ ہوا اور ان کے ہاتھوں کا معائنہ کرنا چاہا۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک روز پہلے ان کے اس ارادے کی خبر مل گئی۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ شجاع اللہ کے گھر خبر بھیجی جائے کہ وہ اگلی روز کالج نہ آئے اور میں جو جماعت کا مانیٹر تھا اور جس پر پروفیسروں کا اعتماد تھا اور جماعت کی اگلی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا، دوسرے روز حاضری کے وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر آخری بنچ پر بیٹھ جاؤں اور جب حاضری لی جائے تو اپنے نام پر اور جب شجاع اللہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باری آئے تو اس کے نام پر بھی (Yes sir) کہہ کر جواب دوں تا کہ شجاع اللہ کی جماعت میں موجودگی کا ثبوت مل جائے چنانچہ میں نے اسی طرح کیا اور شجاع اللہ کو اس روز کالج میں حاضر مانا گیا۔ اس کے بعد ہمارے ہاتھوں کا معائنہ ہوا مگر کسی کے ہاتھ میں زخم نہ ملا۔ اگلے روز شجاع اللہ کالج آ گیا اور باقاعدہ جماعت میں شریک ہوکر پڑھنے لگا اس طرح آگ کا معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد متولی کو بھی رہائی مل گئی اور وہ پھر اسی مزار پر آ گیا۔ اگرچہ جنگ بلقان ختم ہوگئی تھی لیکن ہم مسلمان طالب علموں میں انگریزوں کے خلاف جو جذبات پیدا ہوگئے تھے، وہ نہ صرف موجود تھے بلکہ بڑھ گئے تھے اور ہماری ہمیشہ یہی آرزو تھی کہ انگریزوں کے برخلاف کوئی کاروائی کریں۔ اس زمانے میں بنگال میں تقسیم بنگال کے برخلاف ایجی ٹیشن تھا اور بنگالی انگریزوں کے برخلاف بمباری کیا کرتے تھے اس لئے ہم لوگوں کو بھی خیال آیا کہ بنگالی ہندوؤں کی طرح بم سازی کریں یا بم کہیں سے حاصل کریں۔ یہ خیال ایک طفلانہ آرزو پر مبنی تھا۔ کیوں کہ بنگالی ہندو جو تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کی وجہ سے اس تقسیم کے برخلاف تھے بھلا وہ کیسے ہم کو اپنا ہم راز بنا کر بم سازی سکھاتے یا ہم کو بم فراہم کرتے۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، جو اس وقت کلکتہ میں ''الہلال'' نکالا کرتے تھے، سے مل کر ان کے ذریعے سے بم حاصل کریں۔ اس غرض سے ہم نے شیخ عبداللہ کو کلکتہ بھیجا لیکن وہ وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا کیوں کہ مولانا آزاد مرحوم کا ایسی سیڈیشن کی کاروائیوں اور قتل وغارت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جنگ بلقان ختم ہونے کے بعد 1913ء میں ہم نے ایف ایس سی کا امتحان دیا۔ خوشی محمد، شجاع اللہ اور عبدالحمید میڈیکل کالج چلے گئے اور جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ میں وظیفہ لے کر بی اے میں داخل ہوگیا۔ والدین کی خوشی تھی کہ بی اے کے بعد انجینئرنگ کالج رڑکی میں داخلہ دلائیں، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ بی اے میں پیور میتھیمیٹکس اے کورس اور فزیکس لینے کا فیصلہ کرنے کے لئے بھائی صاحب نے مجھے استخارہ کرنے کو کہا۔ میں نے عشاء کی نماز کے بعد استخارہ کی دعا پڑھی اور سوگیا۔ میں نے رات کو جو خواب دیکھا اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ مجھے پیور میتھیمیٹکس لے کر انجینئرنگ کالج کی تیاری کرنا چاہئے اس پر میں نے [illegible] اے اور بی کورس لیے حالانکہ اس سے پہلے مسلمان اکثر ریاضی سے جھجک کر تاریخ فلسفہ وغیرہ جیسے آسان مضامین لیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں تھرڈ ایئر کے طالب علم شیش محل نام کے ہوسٹل میں رہا کرتے تھے اس لئے ہم کو کواڈرینگل سے شیش محل جانا پڑا۔ وہاں بھی مجھے علیحدہ کمرہ ملا اور میں بدستور سابق اپنی پڑھائی میں تن دہی سے مشغول اور مصروف رہا ورزش باقاعدہ کیا کرتا تھا صبح لارنس گارڈنز تک دوڑ لگایا کرتا تھا شیش محل میں میرا کمرہ باغ کے احاطے میں تھا۔

ایک شام کو جب میں کمرے سے نکلا تو باغ سے ایک سانپ کو آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دبے پاؤں کمرے میں واپس آ کر وہاں سے ہاکی کی اسٹک لی اور اس سانپ کو مار ڈالا۔ جب میرے دوسرے ہم جماعت کو اس کا علم ہوا تو وہ بڑے مشکور ہوئے اور میری جرات کو سراہنے لگے۔ اس سال چونکہ ہم اپنے میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے دوستوں سے دور تھے اور ان سے ہماری چنداں ملاقات نہ ہوتی تھی اس لئے ہمارے قومی جذبات ذرا سو سے گئے تھے۔ فورتھ ایئر میں ہم پھر کوڈرینگل آ گئے تھے۔ یہاں ہر سال کیوبیکلز کی تقسیم ہوتے وقت سب سے پہلے تھرڈ ایئر میں اول نمبر پر پاس ہونے والے طالب علم کو سب سے اچھا کیوبیکل چھانٹنے کا حق دیا جاتا تھا۔ یہ حق اس دفعہ مجھے ملا۔ اس پر میرے دوست سردار محمد صاحب نے جو مجھ سے ایک سال آگے تھے، کہا کہ بڑے گیٹ کے پہلو کا کمرہ جس کو رواج کے مطابق اول نمبر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنے والا طالب علم لیا کرتا تھا، میں لے لوں، کیوں کہ شام کو فٹ بال فیلڈ کو جانے کے لئے ہر کوئی وہاں سے گزرتا ہے جس کی وجہ سے وہاں ہمیشہ بہت شور ہوا کرتا ہے اور مطالعہ مشکل ہوجاتا ہے۔ اس لئے اوپر کی منزل میں سپرینٹنڈنٹ کے کمرے کے نزدیک ایک کمرہ پسند کرنا میرے لیے بہتر ہوگا۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کرکے اوپر کی منزل میں کمرہ لے لیا پڑھنے کے لئے۔ بیشک یہ کمرہ بہت اچھا ثابت ہوا لیکن اوپر کی منزل ہونے کی وجہ سے گرمی میں آرام دہ نہ تھا۔

1914ء میں فورتھ ایئر کے مسلمان طالب علموں میں اسلامی جذبات بہت بڑھ گئے تھے ہم سب مل کر مسلمان ملکوں کے ادبار کا چرچا کیا کرتے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی اس سے ہم سب جرمنوں کی کامیابی کی تمنا کرنے لگے کہ اب ہندوستان ضرور آزاد ہوجائے گا۔ ان دنوں انگریز فوجی بھرتی پر زور دے رہے تھے اور مسلمان طالب علموں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مائل کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک روز ہماری انگریزی کے پروفیسر مسٹر وادن نے مجھے کہا کہ ''آپ فوج میں بھرتی ہوجائیں۔''

میں نے جواب دیا کہ ''اگر فوجی کمیشن دو تو میں فوجی ہونے پر تیار ہوں۔''

اس زمانے میں انگریز ہندوستانیوں کو فوج میں افسر نہیں بنایا کرتے تھے بلکہ زیادہ سے زیادہ نائک حوالدار یا صوبہ دار یعنی Non Commissioned افسر بنایا کرتے تھے۔

اس پر پروفیسر وادن نے کہا ''تمہیں اپنے ملک اور اپنی حکومت کے لئے لڑائی پر جانا چاہئے۔''

میں نے اس کے جواب میں کہ ''یہ ملک میرا ملک نہیں ہے کیوں کہ اس کی حکومت ہماری حکومت نہیں ہے۔''

اس جواب پر پروفیسر وادن بڑا چیں بہ جبیں ہوا لیکن خاموش رہا۔

کچھ ماہ بعد ترکی نے جرمنی کے ساتھ شریک ہوکر انگریزوں کے برخلاف اعلان جنگ کردیا اور جہاد کا فتوئ دے دیا۔ ہم نے اس فتوے کے مطابق ایک فوٹوگراف انگریزی جریدہ (گرافیک) میں دیکھا جس میں ایک تصویر سلطان ترکی کی تھی جو ایک عام جلسے میں جہاد کا فتوئ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The Sultan Proclaiming Jehad (Holy War) Turkey Pronouncingher own Death Sentance. (یعنی سلطان جہاد مقدس کا اعلان کررہے ہیں۔ ترکی اپنی موت کا فتوئ خود ہی دے رہی ہے۔)

اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی دو جماعتیں جو مدتوں سے انگریزوں کے خلاف خفیہ کام کررہی تھیں ہمارے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ ان میں سب سے اہم مجاہدین کی جماعت تھی جس کا مرکز اسمس (Asmas) کے گاؤں علاقہ بنیر (Buneer) میں ہے اس جماعت کی بنیاد 1248ھ 1832ء میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کی طرف سے جو حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید کے شاگردوں میں سے تھے، ڈالی گئی تھی۔

سلطنت مغلیہ کے زمانے میں سید احمد بریلوی کی قیادت میں مولانا شاہ اسماعیل صاحب برادر زادہ عبدالعزیز صاحب پسر شاہ ولی اللہ صاحب نے ہندوستان کی آزادی کے لئے سندھ کے راستہ افغانستان آکر سرحد میں ایک مرکز قائم کیا تھا۔ ان کا مقصد افغانستان سے تعلق پیدا کرنا اور سکھوں کی سلطنت کو پنجاب سے ختم کرکے پھر سلطنت دہلی اور وسط ایشیا کے درمیان، جہاں سے مختلف زمانوں میں نئے نئے مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان پر یلغار کرکے یہاں کی اسلامی حکومت میں تازہ اسلامی خون ڈالنے کی بارہا کوششیں کی تھیں، پھر ایک دفعہ رشتہ اور رابطہ پیدا کرنا تھا۔ اس سلسلے میں 1831ء میں بالاکوٹ (ضلع ہزارہ) کی لڑائی میں جو سکھوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف ہوئی تھی افغانی سرداران پشاور نے جنگ کے بڑے نازک موقع پر شاہ اسماعیل شہید اور ان کے کمانڈر سید احمد شہید کا ساتھ چھوڑ دیا جس سے ان کی فوج کو شکست ہوئی تھی اور وہ خود جام شہادت نوش کر گئے تھے۔

اس طرح مسلمانوں کی یہ کوششِ آزادی بھی خاک میں مل گئی تھی۔ اس پر مولانا ولایت علی اور ان کے بھائی مولوی عنایت علی نے شاہ اسماعیل صاحب کی باقی ماندہ پیروؤں کو جمع کر کے جماعت مجاہدین کی بنیادی ڈالی جس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا تھا۔ انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہونے کے بعد بھی یہ جماعت چندہ جمع کرنے اور نئے ممبر بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ چنانچہ اس ذیل میں ہمارے رشتہ دار مولوی محمد جعفر صاحب جو تھانیسر ضلع کرنال کے رہنے والے تھے، اس جماعت کے لئے خفیہ چندہ جمع کر کے سرحدی علاقہ کو بھیجا کرتے تھے۔ ایک نوکر کی غداری کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھ پڑے اور انگریزوں نے ان کو کالے پانی (یعنی جزیرہ انڈمان) بھیج دیا تھا۔ بعد میں ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی کی ساٹھویں سالگرہ پر ان کو معافی ملی اور وہ کرنال آگئے تھے۔ میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا دیکھا تھا اور ان کو (چچا جی) کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

میرے کالج کے زمانے میں اس جماعت کے نمائندے پنجاب میں وزیر آبادی مولوی فضل الٰہی تھے اور ان کا رابطہ لاہور میں مولوی عبدالرحیم المعروف بہ مولوی بشیر سے تھا۔ گورنمنٹ کالج کے مسلمان طالب علموں میں سے شیخ عبداللہ کا ان صاحبان سے تعارف ہوگیا تھا۔ انہوں نے اس کے ذریعے دوسرے مسلمان طلباء کے خیالات کا پتہ لگایا۔ جب ان کو اطمینان ہوگیا تو انہوں نے خلیفۃ المسلمین کے فتویٰ جہاد کی ایک نقل ہمارے پاس بھیج دی۔ اس سے ہم سب میں ترکوں کی صفوں میں شریک ہوکر انگریزوں کے برخلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ہمارے اس قسم کے خیالات کو قوی تر بنانے کے لئے انہوں نے ہمیں سپارہ (10) سورہ توبہ رکوع (3) آیت:

ترجمہ: ''تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جس کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ راستہ نہیں دکھاتا نافرمان لوگوں کو۔''

پڑھنے، اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کی اور کہا کہ جہاد کے لئے اس دارالکفر سے نکل کر ہمیں ایک دارالسلام میں چلے جانا چاہئے اور وہاں سے ترکی فوج میں داخل ہونے کے لئے ترکی پہنچنا چاہئے۔ ہم سب اس پر راضی ہوگئے لیکن میں نے استخارہ کئے بغیر اس طرح کا فیصلہ کرنا نہ چاہا۔ استخارے کے بعد میں نے رات کو خواب دیکھا کہ ایک سرسبز پہاڑی علاقے میں ہوں۔ میں نے اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ مجھے بھی ہندوستان چھوڑ کر سرحد کے پہاڑی علاقے میں چلا جانا چاہئے۔ اس طرح میں نے بھی ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی اپنے دوستوں کو اطلاع دی۔ رازداری کے لئے ہم سب نے قرآن شریف پر قسم کھانے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے ہم سب ہم خیال طلباء نے یعنی گورنمنٹ کالج سے ایم اے کے طالب علم میاں عبدالباری اور شیخ عبدالقادر بی اے کے طالب علم عبدالمجید خان، اللہ نواز خان، شیخ عبداللہ، عبدالرشید، عبدالرحمن، غلام حسین اور میں، چیف کالج سے بی اے کا طالب علم عبدالخالق، اسلامیہ کالج سے بی اے کا طالب علم محمد حسن، میڈیکل کالج سے سیکنڈ ایئر کے طالب علم خوشی محمد، عبدالحمید، رحمت علی اور شجاع اللہ 6 جنوری 1915ء اتوار کے روز کشتی پر دریائے راوی میں گئے اور وہاں منجدھار میں قرآن شریف پر رازداری اور جہاد میں شریک ہونے کا حلف اٹھایا۔

بعد میں ہماری اس ٹولی میں اللہ نواز کا بھائی شاہ نواز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خان جس کی تعلیم بہت کم تھی اور اللہ نواز خان کے خاندان کا پروردہ عبدالحق نام کا ایک ان پڑھ سانو مسلم بھی شریک ہوگیا تھا۔ اس کے بعد مولوی فضل الٰہی اور مولوی بشیر سے مل کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کو سرحد پار چلا جانا چاہیے۔ اس سفر کے سارے انتظامات گورنمنٹ کالج کے طلباء کے لئے عبداللہ نے اور دوسرے کالج کے طالب علموں کے لئے خوشی محمد نے ان مولوی صاحبان سے مل کر کیے اور 5 فروری 1915ء جمعہ کا دن ہماری روانگی کے لئے مقرر ہوگیا۔

راز داری کی قسم کھانے اور سفر کے دن کے درمیان تین دن میں، میں اپنے والدین کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے چھٹی پر کرنال گیا۔ والدین کرنال میں نہ تھے وہ بھائی صاحب کے پاس جو ان دنوں انبالہ ڈویژن میں اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز لگے ہوئے تھے، رہتے تھے۔

کرنال میں صرف ہمشیرہ صاحبہ تھیں۔ انہوں نے مجھے پڑھائی کی وجہ سے ذرا دبلا پایا اور میری صحت کو قدرے مضمحل دیکھا۔ اس پر انہوں نے مجھے دو دن گھر رکھا اور میری صحت کی درستی کے لئے ہر طرح کا آرام پہنچانے کی بہت کوشش کی۔

میں کرنال میں مولوی عبداللہ شاہ صاحب مرحوم کا مرید بن چکا تھا جو حکیم بھی تھے اور عالم بھی تھے جن کا کرنال میں مطب تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ جو وعظ کیا کرتے تھے ان سے میں نے کرنال میں رہتے ہوئے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ میرے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان چھوڑنے کے لئے ان کو اپنے ارادے سے مطلع کروں۔ میں نے ان سے جہاد کے فتوٰی کا ذکر کیا اور پوچھا ''کیا ہمیں اب دارالکفر سے نکل جانا چاہیے؟''

انہوں نے فرمایا کہ ''ضرور نکل جانا چاہیے لیکن بی اے کا آخری امتحان جو ایک ماہ بعد ہونے والا ہے دے کر جاؤ''

میرے لئے ایک ماہ کا انتظار کرنا ناممکن تھا کیوں کہ ہم سب نے مل کر تاریخ روانگی مقرر کرلی تھی اور اس پر قسم کھا چکے تھے، اس لئے میں نے ان کو اس بارے میں کوئی جواب نہ دیا۔ مگر ان سے پوچھا: ''آپ کیوں اس دارالکفر سے نہیں نکلتے؟''

انہوں نے فرمایا کہ ''میں اس عمر میں یہاں رہ کر اسلام کی زیادہ خدمت کرسکتا ہوں۔''

اگر میرے لئے کسی طرح بی اے کا امتحان دینا ممکن ہوتا تو یہ میری آئندہ کی زندگی میں بہت مفید ثابت ہوتا۔ مجھے امتحان میں پاس ہونے کا یقین تھا اور مجھے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ بی اے کے ڈگری امتحان کے بعد ضرور مل جائے گی جس کی مجھے ہندوستان سے باہر جانے کے بعد کئی دفعہ ضرورت پیش آئی، لیکن ان حالات میں میرے لئے نا ممکن تھا کہ امتحان دینے کے لئے ایک ماہ اور ہندوستان میں ٹھہروں اور اپنے دوستوں سے پیچھے رہوں۔ آخر دو دن کرنال میں رہ کر ہمشیرہ صاحبہ سے یہ کہہ کر جدا ہوا کہ: ''اگر خدا کو منظور ہوا تو پھر ملیں گے ورنہ یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہے۔'' وہ اس پر حیران ہوئیں کہ آخر میں ایسی باتیں کیوں کررہا ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے تفصلات نہیں پوچھیں۔

کالج واپس آیا تو سب نے میری صحت میں نمایاں بہتری دیکھی حالانکہ اس سے پہلے میں امتحان کی تیاری پر دن رات سبق پڑھنے کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا۔ کرنال سے واپس آ کر میں پہلے کی طرح تن دہی سے سبق نہیں پڑھتا تھا۔ اس سے کالج میں سب لوگ حیران تھے کہ اس کو کیا ہوگیا ہے۔ امتحان کے دن اتنے نزدیک ہیں اور یہ زیادہ محنت نہیں کرتا پھر امتحان میں اول نمبر کیسے آئے گا؟ میرے مسلمان دوستوں اور ہم جماعتوں کو امید تھی کہ میں بی اے میں اول رہوں گا۔ میں اگرچہ بہت ذکی نہ تھا اور نہ ہی میرا حافظہ (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) بہت قوی تھا لیکن باقاعدہ سبق پڑھنے اور محنت سے مطالعہ کرنے کی وجہ سے کالج میں ہمیشہ اول ہی رہتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا اور بہت سے انعامات حاصل کر چکا تھا۔ اس لئے اب بی اے میں بھی مجھ سے یہی توقع کی جاتی تھی کہ میں اسٹیٹ اسکالرشپ لے کی ولایت جاسکوں گا۔ چوہدری ظفر اللہ صاحب پہلے مسلمان تھے جن کو یہ وظیفہ ملا تھا۔ ان کے بعد کئی سال تک کسی مسلمان کو یہ وظیفہ نہیں مل سکا۔ اب سب مسلمانوں کی امیدیں اس پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ وظیفہ پھر ایک مسلمان طالب علم کو ملے گا۔ لیکن تدبیر کند بندہ۔ تقدیر کند خندہ۔ میری قسمت میں کچھ اور ہی لکھا ہوا تھا اور آب ودانہ مجھے دوسرے ملکوں کی طرف کھینچ رہا تھا۔ 4 فروری 1915ء کی شام گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علموں نے ایک ڈرامہ کیا جس میں عبدالباری کا بھی پارٹ تھا۔ اس ڈرامے میں عبدالباری صاحب پاؤں میں بیڑیوں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئے اور وہ اپنی بے کسی کی حالت پر یہ شعر پڑھ رہے تھے:

خدایا تو ہی مورا، بھروسہ ہے مجھے تورا ہی تورا

ہم لوگوں نے، جنھوں نے اگلے دن 5 فروری 1915ء کو بھاگنے کا ارادہ کیا ہوا تھا، جب اس کو اس حالت میں دیکھا تو ذرا خوف زدہ ہوگئے کہ کہیں خدانخواستہ اگلے روز عبدالباری اور ہم سب لوگ اس طرح ہتھکڑیاں لگے کالج سے قید خانے میں نہ لے جائے جائیں۔

سرحد کو ہماری روانگی:

5 فروری 1915ء کو جمع کی نماز کے بعد پہلا قافلہ ہری پور ہزارہ کو روانہ ہوگیا جس میں خوشی محمد، عبداللہ، عبدالباری، عبدالمجید، اللہ نواز خان اور شیخ عبدالقادر شامل تھے دوسرا قافلہ جس میں عبدالرشید عبدالحمید، محمد حسن، رحمت علی شان نواز خان عبدالحق اور میں شریک تھے رات کی گاڑی سے چلا۔ ہم سب علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں بیٹھے تھے تاکہ ہمارے اکٹھے سفر کی وجہ سے لوگ ہم کو شبہ کی نظر سے نہ دیکھیں اور ہماری گرفتاری کا سبب نہ بنیں۔ ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالخالق وقت پر اسٹیشن نہ پہنچنے کی وجہ سے پیچھے رہ گیا اور ہجرت نہ کرسکا۔ شیخ غلام حسین کی صحت چونکہ خراب تھی اس نے ہجرت کا ارادہ ہی نہ کیا تھا، اس لئے وہ بھی پیچھے رہ گیا۔

ہم 6 فروری 1915ء کو صبح کے قریب ہری پور ہزارہ پہنچے۔ وہاں پہلے قافلے کے ساتھ ہری پور پہنچ کر ہمارے استقبال کے لئے ہمارا ایک ساتھی اسٹیشن پر ہمیں ملا اور ہم کو عبدالرحمٰن آذر، جو اب ریٹائرڈ چیف انجینئر جنرل منیجر ہیں کے والد محمد الٰہی صاحب کے گھر لے گیا۔ وہ مولوی فضل الٰہی کے بڑے بھائی اور ریلوے انسپکٹر تھے۔ یہاں ہم سب پھر اکٹھے ہونے کی وجہ سے بہت خوش ہوئے۔ دن بھر اس گھر میں چھپے رہے اور کوئی شخص بھی یہاں سے باہر نہ نکلا۔ شام کے وقت ہم نے سرحدی لوگوں جیسے کپڑے اور پاؤں میں بوٹوں کے بجائے چپلیاں پہنیں اور سفر کے لئے تیار ہوگئے۔ آخری وقت میں ہم میں سے ہر ایک کو ایک مستعار نام دیا گیا تاکہ راستے میں لوگوں کو ہمارے اصلی نام سننے سے ہمارے بھاگنے کے راستے کا کھوج نہ مل جائے۔ (میرا نام الیاس رکھا گیا) قافلہ سالار عبدالمجید خان جو گورنمنٹ کالج کی ٹگ اوف وار ٹیم کے کپتان اور خوب توانا آدمی تھے مقرر کردیئے گئے۔ سب کے پاس جتنا روپیہ تھا اس کو ایک جگہ جمع کرکے مساوی طور پر تقسیم کردیا گیا۔ اس طرح کسی کو دوسرے ساتھی پر تفوق اور برتری نہ رہی۔ سب ایک ہی درجے پر آگئے تاکہ رئیس قافلے کی نظر میں سب برابر ہی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پاس میرے سیونگز اکاؤنٹ کا روپیہ اور بی اے آخری امتحان کی فیس داخلہ کو ملا کر (52) روپے تھے۔ چند ایک دوستوں کے پاس اس سے کچھ زیادہ رقم تھی لیکن اکثر کے ہاتھ میں اس سے کم روپیہ تھا۔

ہماری رہنمائی کرنے والا اور ہم کو سرحد علاقے سے گزار کر جماعت مجاہدین کے مرکز اسمس واقع بنیر کو لے جانے والا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرحدی شخص بھی ہری پور ہزارہ پہنچ گیا تھا اس کو صرف ہمارے مستعار نام بتائے گئے۔

شام کو اندھیرا ہونے پر ہمارا قافلہ سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن ہمیں یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوا کہ نئی چپلوں کی وجہ سے جلد ہی ہمارے پاؤں میں چھالے پڑنے لگے۔ ہم لوگوں کو پیدل چلنے کی بھی مشق نہ تھی۔ اس لئے کچھ گھنٹے کے بعد ہمارے لئے پیدل چلنا دشوار ہوگیا۔ سب سے زیادہ تکلیف عبدالباری کو ہوئی اور وہ چلنے سے بالکل عاجز ہوگیا۔ اس کو وہاں راستے میں چھوڑ کر ہمارا آگے چلنا ناممکن تھا اس لئے اس کو دو ساتھی باری باری کندھا دے کر ساری رات چلاتے رہے۔ جب ہم تھک جاتے تو رہنما کی اجازت سے چند ایک منٹ آرام کرتے تھے۔ اس وقفے میں اکثر دوست تکان کی وجہ سے ایک دو لحظہ سونا غنیمت جانتے تھے۔ اس لئے فوراً زمین پر لیٹ جاتے اور سو جاتے تھے۔ سرحد کا فاصلہ کوئی بیس میل کا تھا جس کو اسی رات طے کرنا اور ریاست امب (Amb) میں داخل ہونا ہمارے لئے ضروری تھا ورنہ اگلے دن پکڑے جانے کا ڈر تھا۔

اس زمانے میں ریاست امب کے نواب کے اختیارات اتنے تھے کہ انگریز ان سے کسی ہندوستانی پناہ گزین کی واپسی کا مطالبہ نہ کرسکتے تھے۔ ہم ریاست امب کی طرف اس طرح تھکے ماندے بڑھ رہے تھے کہ آرام کے وقفوں میں سے ایک کے درمیان خوشی محمد زمین پر سوگیا اور جب ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو وہ باوجود ہمارے جگانے کے، نیند کی زیادتی کی وجہ سے بیدار نہ ہوا۔ کچھ دور چلنے کے بعد جب ہم نے اپنے ساتھیوں کو گنا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کم ہے۔ واپس آکر اس کو ڈھونڈنا تو ہمارے لئے ناممکن تھا اس لئے اس کی قسمت پر چھوڑ کر آگے بڑھے۔ چونکہ سرحد کے پاس ایک انگریزی چوکی تھی اور ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم رات کے اندھیرے میں اس چوکی کے پاس سے گزر کر سرحد پار کرجائیں۔ خدا کی شان کہ آدھی رات کے کچھ گھنٹے بعد بارش شروع ہوگئی اور اس رات فوجی چوکی سے کوئی پیٹرول دورہ لگانے نہ نکلا۔ اس لئے ہم بخیر اس چوکی کے پاس سے گزر گئے اور دریائے سندھ کے پاس ریاست امب کی ایک مسجد میں 7 فروری 1915ء کو تقریباً دن کے دس بجے پہنچ گئے۔ مسجد کی چھت رات کی بارش کی وجہ سے ٹپکنے لگی تھی۔ ہم تکان سے اتنے چور تھے کہ کسی میں ہاتھ اٹھانے کی سکت نہ تھی۔ رحمت علی خاص کر اتنا تھک گیا تھا کہ مسجد میں جس جگہ وہ لیٹا وہاں چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی سے بھی اپنے کو بچانے کے لئے حرکت نہ کرسکا۔ چھت سے ٹپکتا ہوا پانی قطرہ قطرہ اس کے منہ پر گر رہا تھا لیکن اس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اس سے بچنے کے لئے اپنے سر کو ذرا ہلا کر پرے کر لے۔ دوپہر کو نواب امب کے وزیر نے جو جماعت مجاہدین کی خفیہ طور پر حمایت کیا کرتا تھا، ہمیں پلاؤ کی دعوت دی جس سے ہمارے جسم میں پھر طاقت آگئی۔ وزیر صاحب کے ہمدردانہ الفاظ سے ہماری ہمتیں بھی بڑھ گئیں۔ دوپہر کے بعد ایک چھوٹی سی ناؤ پر ہم کو دریائے سندھ پار کرادیا گیا۔ یہاں دریا کا پاٹ بہت کم تھا اس وجہ سے اس کی گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ پانی کی رو بالکل معلوم نہ ہوتی تھی۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اتر کر ہم نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ خیریت سے سلامتی کی جگہ پہنچ گئے کیوں کہ اس زمانے میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے سے اس جگہ پر علاقہ آزاد شروع ہوتا تھا۔

میرا Career جس کے لئے والدین نے اور بھائی صاحب نے مجھے اتنی قربانیاں دے کر تیار کیا تھا یہاں ختم ہوگیا۔ رشتہ داروں کی ان ساری امیدوں پر جو مجھ سے وابستہ تھیں پانی پھر گیا۔ اب میں ایسی سرزمین کی طرف روانہ ہورہا تھا جہاں نہ کوئی میرا واقف تھا اور نہ وہاں کی زبان میں جانتا تھا۔ اس سرزمین میں کیسے گزارا کروں گا؟ وہاں کوئی مفید کام کرسکوں گا یا نہیں؟ یہ سب کچھ مجہول اور نامعلوم تھا۔ اگر تسلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی تو صرف یہ تھی کہ اسلامی احکام کی پابندی کے لئے سب قربانیاں دے رہا ہوں۔

دریائے سندھ کو اس طرح پار کرنے کے بعد ہم نے وہ رات نواب امب کے علاقے میں گزاری۔ وزیر صاحب نے ہماری خوب خاطر تواضع کی جس کی وجہ سے ہماری تکان بالکل رفع ہوگئی اور ہم اگلے روز اپنے کٹھن سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ جب 8 فروری 1915ء کو ہم علی الصبح چلنے لگے تو دیکھا کہ ایک روز پہلے کی بارش نے نالوں کو ندیاں اور ندیوں کو دریا بنا دیا ہے۔ اس لئے ہمیں راستے میں کافی تکلیف ہوئی اور ہماری رفتار بہت کم رہی۔ بعض جگہوں پر نالوں کے کنارے راستہ نہ ملا اور ہمیں ٹیلوں اور پہاڑوں پر چلنا پڑا۔ چند ایک جگہ تو پہاڑیوں پر چڑھنا اتنا مشکل ہوا کہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اوپر کھینچا۔ چونکہ بارش کی وجہ سے پاؤں پھسلتے تھے اور پودوں اور گھاس کو پکڑ کر ان کے سہارے سے اوپر چڑھنا ناممکن تھا۔

دوپہر کی روٹی جو کچھ ہمارے پاس تھی۔ اس کو ایک نالے کے درمیان کے جزیرہ جیسی ایک خشک جگہ پر کھایا۔ یہ آرام کا وقفہ ہمارے لئے بہت پرلطف گزرا۔ ان انگریزوں کا ذر دل میں باقی نہ رہا۔ تکان بھی زیادہ نہ تھی۔ بارش بند ہوچکی تھی۔ ہمیں ہر طرح کا اطمینان میسر تھا۔ چاروں طرف سربہ پہاڑ کھڑے ہوئے تھے، زمین ہر طرف سرسبز تھی، نالے ٹھاٹھا کر بہہ رہے تھے۔ یہ سب کچھ ایسا دل افزا نظارہ تھا کہ اس سے ہم سب بہت محظوظ ہوئے۔ اپنے والدین اور اقربا کے آنسوؤں سے بے پرواہ اور آنے والی زندگی کے نشیب وفراز سے بے خبر تھے۔ ہم اس نظارے سے کچھ ایسے بہرہ اندوز ہوئے کہ بے اختیار Romance Romance کہنے لگے۔ عبدالباری اور شیخ عبدالقادر جو ذرا شاعر مزاج تھے، اس منظر کا کافی مزہ اٹھا رہے تھے۔

جماعت مجاہدین کے مرکز سے کابل روانگی:

ہم 8 فروری 1915ء کو شام کے قریب جماعت مجاہدین کے مرکز (اسمس) واقع علاقہ بنیر میں پہنچ گئے۔ اسمس اصل میں ایک سرحدی گاؤں کا نام ہے جس کے نزدیک مجاہدین کی بستی ہے۔ اس گاؤں کے نام پر اس بستی کو مرکز اسمس کہا جاتا ہے۔ اس مرکز میں رہنے والے مجاہدین کی تعداد بمع اہل وعیال کوئی سو کے قریب تھی۔ شادی شدہ لوگوں سے کنوارے مجاہد زیادہ تھے اس زمانے میں جماعت مجاہدین کے رئیس مولوی عبدالکریم صاحب تھے۔ مگر وہ ہمارے اسمس میں پہنچنے سے پہلے ہی صاحب فراش ہوچکے تھے اور ہمارے آنے کے تین دن بعد یعنی 11 فروری کو فوت ہوگئے۔ ان کے جانشین ان کے بھتیجے نعمت اللہ ہوئے جو نوجوان تھے اور جن کو ذرا دنیا کے حالات سے دلچسپی تھی۔

اسمس پہنچنے پر ہمیں دوسرے مجاہدوں کے گھروں سے جدا ایک کوٹھڑی میں جگہ دی گئی۔ اس کوٹھڑی میں صرف ایک کھڑکی اور اس کا صرف ایک دروازہ تھا۔ کھڑکی میں شیشہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سردی میں یہاں فرش پر آگ جلائی جاتی تھی، جس کا دھواں باہر نکلنے کے لیے چمنی (Chimney) کے بجائے اس کی چھت میں ایک سوراخ (مورچہ) تھا۔ کوٹھڑی کو رات کے وقت روشن کرنے کے لیے ایک مٹی کا دیا جلایا جاتا تھا۔ شہروں کی زندگی جس کو ہم سب اب پیچھے چھوڑ آئے تھے اور یہاں کے حالات کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ کھانے کے لیے دال روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں کے قیام کے دوران ہم نے صرف ایک دفعہ پلاؤ کھایا لیکن سب دوستوں کے ارادے اتنے پختہ اور ایمان اتنا محکم تھا کہ کسی کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا۔

مرحوم عبدالکریم کی وفات کے تین روز بعد رئیس جماعت مجاہدین مولوی نعمت اللہ نے ہمیں باریابی دی اور دنیا کا ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقشہ نکال کر اس پر مختلف جنگی میدانوں کے متعلق ہم سے معلومات حاصل کیں اور جنگ کے بارے میں اپنے خیالات بتائے۔ ہمیں اس کی امید نہ تھی کہ ایسے پہاڑی علاقے میں رہنے والے ایک شخص کو جو تقریباً انگریزوں کے محاصرے کے اندر رہنے پر مجبور ہے اور جس کو مہذب دنیا سے تعلق رکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ضروریات زندگی بھی ہندوستان سے بہ صد مشکل حاصل کرتا ہے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی خفیہ طور پر وہاں سے لاتا ہے، دنیا کے حالات سے اتنی واقفیت ہوگی۔ اس ملاقات کے بعد ہمارے دلوں میں ان کا وقار بڑھ گیا۔ جماعت مجاہدین جو ایک مقصد کے لئے بنائی گئی تھی اس کے ارکان بہت مخلص اور جانثار تھے۔ سراپا تحمل اور ہر قسم کی مصیبتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کو تیار تھے۔ ان کو نہ مال دولت کی آرزو تھی اور نہ دنیوی جاہ وعزت کی تمنا تھی۔ وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے اور اس امید پر کہ ان کو ایک دن کفار سے لڑنے، جہاد کرنے اور میدان جنگ میں جام شہادت پینے کا موقع ملے گا، وہ اپنی ساری زندگی کو ایسی ہی مشکلات میں گزارنے اور ہر قسم کے آرام سے محروم رہنے پر تیار تھے۔

لیکن افسوس ہے کہ ان کو دنیا کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق کوئی تعلیم وتربیت دینے والا اور ان کو نئے فوجی قواعد سکھانے والا نہ تھا۔ ان میں سے بہت سے بالکل ان پڑھ تھے۔ نہ ان کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی خاص ذریعہ موجود تھا اور نہ کسی دنیوی تربیت کا سامان تھا۔ آتشیں ہتھیاروں اور بارودوں کی ایجاد کے بعد تلوار اور ڈھال سے لڑائی کا موقع ختم ہو چکا تھا لیکن وہ بے چارے ابھی تک تلوار سے حملہ کرنے کا قاعدہ سیکھا کرتے تھے۔ ان کے باپ دادا کے متعلق جنہوں نے سکھ اور انگریزی فوجوں سے لڑائی کی تھی اور اپنی بہادری کی وجہ سے ان کے دلوں پر رعب ڈالا تھا، انگریز مصنف لکھتے ہیں کہ ''وہ بے دریغ تلوار بہ کف مشین گنوں پر ہلہ بول دیا کرتے ہیں اور اس طرح اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں یا دشمن کو نیست ونابود کر دیتے ہیں۔'' لیکن تلوار نیزے اور برچھے سے لڑنے کا زمانہ تو مدتوں سے ختم ہو چکا تھا۔ جماعت مجاہدین کے گھر ایک ٹیلے پر واقع تھے جس کے اردگرد (بریدد) نالہ پیچ وخم کھاتا ہوا بہتا تھا۔ اس ٹیلے کے دامن میں ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں مجاہدین میں سے چند لوگ ہر روز دوپہر کے وقت ڈھال تلوار کے استعمال کی مشق کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس نئی بندوقیں صرف چند ایک تھیں۔ ہم نے ان کو بندوق سے نشانہ بازی کرتے ہوئے کبھی بھی نہیں دیکھا۔ بندوق کی گولیاں کم ہونے کی وجہ سے وہ فائرنگ بھی کبھی نہ کیا کرتے تھے۔ یہ بندوقیں رئیس مجاہدین کے ہاتھ میں تھیں۔ باقی لوگوں کے پاس چقماقی یا فتیلی بندوقیں تھیں جن کا استعمال اب دنیا میں شاید کہیں بھی نہ رہا تھا۔ خلاصہ کلام یہ کہ جماعت مجاہدین جس کو اس کے قابل احترام بانیوں نے ہندوستان کی غیر مسلم حکومت سے آزاد کرانے کے لئے ایک جنگی تنظیم کے طور پر بنایا تھا، وہ دنیا کی ترقیات اور زمانے کی رفتار سے بالکل بے خبر رہ کر ایک طفیلی اور مسکین سی ٹولی بن گئی تھی جو اپنے گزارے کے لئے یا ہندوستانی مسلمانوں کے چندے یا حکومت افغانستان کے وظیفہ پر تکیہ لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے پاس کھیت بھی نہ تھے کہ کچھ بو کاٹ کر اپنا گزارا کریں کیوں کہ اس علاقہ میں قابل زراعت زمین بہت کم ہے اور جو ہے وہ بھی مقامی لوگوں کے قبضے میں ہے۔ ان کی ناگفتہ بہ حالت سے چند روز میں واقفیت پیدا کرنے سے ہم پر بہت برا اثر ہوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہاں رہ کر ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے کچھ کام نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں کابل کی طرف جانا چاہئے تاکہ افغانی حکومت کو جنگ میں شامل ہونے پر راضی کریں۔ اگر کہیں کامیابی نہ ہو تو ترکی چلے جائیں اور وہاں ترکی فوجوں میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ اس لئے کابل مجاہدین کا ایک وفد بھیجا گیا تاکہ ہمارے کابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانے کا راستہ صاف کیا جائے اور افغان حکومت سے ہمارے لئے کابل جانے کی اجازت لی جائے۔

ہمارے اسمس پہنچنے کے دو روز بعد خوشی محمد ایک دوسرے رہنما کے ساتھ ہم تک پہنچ گیا۔ اس نے رات کو ہم سے جدا ہونے اور الٹے پاؤں ہری پور پہنچنے کا اور پھر ایک رہنما کے ساتھ ہم تک آنے کا قصہ سنایا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ جب بیدار ہوا تو اس کا منہ ہمارے قافلے کی طرف مڑنے کے بجائے الٹی طرف مڑ گیا اور اس خیال سے کہ قافلے کے پیچھے پیچھے جارہا ہے، راستہ چلتا رہا حالانکہ وہ ہر آن ہم سے جدا اور دور ہوتا جاتا تھا۔

آخر جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی اور اس نے ہری پور کی عمارتیں دیکھیں تو اس کو یقین ہوگیا کہ وہ راستہ گم کرکے قافلہ سے جدا ہوگیا ہے۔ اس پر وہ ریلوے انسپکٹر صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہ اس کی واپسی پر قدرے سہمے لیکن جب اس نے اپنے حالات بتائے تو ان کو اطمینان ہوگیا اور انہوں نے اس کو ایک دوسرے رہنما کے ساتھ ہمارے پاس بھیج دیا۔ اس کے آنے پر ہمیں بہت مسرت ہوئی کیوں کہ وہ ہماری تحریک کے بانیوں میں سے تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ عبدالخالق بھی ہم سے ایک روز بعد ہری پور آیا تھا لیکن اس وقت کوئی رہنما موجود نہ تھا جو اس کو ہمارے پاس لاسکتا، اس لئے اس کو انسپکٹر صاحب نے واپس کردیا۔

ابھی ہمیں اسمس آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک دن ایک سرحدی نے ایک جوتا (بوٹ) لاکر دیا اور کہا کہ ''یہ بوٹ مجھے ایک نالے کے کنارے سے ملا ہے۔ شاید آپ کے لوگوں میں سے کسی کا ہوگا۔'' ہم نے جب یہ بوٹ دیکھا تو عبداللہ نے فوراً اسے پہچان لیا اور کہا کہ ''بوٹ اس کے بھائی عبدالرحمن کا ہے۔'' ہمیں اس کی بات کا چنداں یقین نہ آیا۔ کیوں کہ ہم نے کبھی بھی اس کا گمان نہ کیا تھا کہ عبدالرحمن وہاں آئے گا۔ لیکن عبداللہ نے اصرار کیا اور کہا کہ ''میں ضرور اس نالی کی طرف جاکر اپنے بھائی کو تلاش کروں گا۔'' اس پر مجبوراً خوشی محمد اور عبدالحمید اس کے ساتھ گئے اور جب انہوں نے عبدالرحمن کو بے تاب وتوانا ایک پہاڑی پر دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس کو اپنے ساتھ اسمس لائے اور اس نے اپنی کہانی یوں سنائی:

''جب آپ لوگ لاہور میں میرے بھائی عبداللہ کے کمرے میں خفیہ باتیں کیا کرتے تھے اور ہندوستان سے ہجرت کے منصوبے بنایا کرتے تھے تو میں سونے کا بہانہ کرکے اپنے بھائی کی چارپائی پر لیٹا رہتا اور آپ کی ساری باتیں سنا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے ہجرت کا فیصلہ کرلیا اور ہری پور ہزارے کے راستے جانا مقرر کیا مجھے خوب معلوم تھا کہ میرا بھائی عبداللہ مجھے ساتھ نہیں لے جائے گا اس لئے میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا لیکن جب آپ روانہ ہوگئے تو میں نے تین دن صبر کیا اور آپ کے پیچھے جو کچھ بورڈنگ ہاؤس میں ہوتا رہا اس کو دیکھتا رہا۔ پولیس نے آپ سب کے کمروں کی تلاشی لی کہ شاید آپ کی اس سازش کا کچھ کھوج مل جائے، لیکن کچھ پتا نہ چل سکا۔ صرف ظفر جبین کے کمرے سے اس کا ایک فوٹو پولیس کے ہاتھ لگا۔ اس کے بعد اس کے والد بھی لاہور آئے اور اس کا سامان لے کر واپس چلے گئے۔ مسٹر چاولہ ایک ہندو پروفیسر ریاضی ظفر جبین کے چلے جانے سے اتنا افسوس کیا کرتے تھے کہ ان کو اس کے ہندوستان سے بھاگ جانے کا یقین ہی نہیں آتا تھا اور کہتے تھے کہ ایسا محنتی طالب علم اپنی پڑھائی کو چھوڑ کر کبھی ایسا اقدام نہیں کرسکتا۔ اس لئے انہوں نے دو دن تک لیکچر نہ دیا تاکہ ظفر اپنے سبقوں میں اپنے ہم جماعتوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ جب پولیس کی بھاگ دوڑ ختم ہوگئی اور معاملہ ٹھنڈا پڑا تو میں نے بھی ہری پور ہزارا جانے کا فیصلہ کیا وہاں پہنچ کر ریلوے انسپکٹر سے ملا۔ لیکن چونکہ کوئی رہنما موجود نہ تھا، اس لئے انہوں نے مجھے واپس جانے کو کہا۔ لیکن میں نے ان کی بات نہ مانی۔ ان سے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے راستہ پوچھا انہوں نے مجھے کچھ معلومات دیں اور میں انہی معلومات کی بنا پر روانہ ہوگیا بڑی مشکل کے ساتھ یہاں پہنچا۔ راستہ میں ایک پہاڑی پر چڑھتے ہوئے میرا پاؤں پھسلا۔ اس سے میرا ایک بوٹ پاؤں سے نکل کر نالے میں گر پڑا۔ مجھے اتنی جرات نہ ہوئی کہ پہاڑی سے اتر کر جوتا لے لوں۔ بہت کم امید تھی کہ صحیح سالم آپ کو مل سکوں گا۔

عبداللہ اپنے بھائی کے آنے سے چنداں خوش نہ ہوا۔ ہم بھی مطمئن نہ تھے لیکن اس کو واپس بھیج دینا خطرناک اور مشکل تھا۔ اس لئے اس مہمان ناخواندہ کو ہم نے اپنے ساتھ لے لیا لیکن جیسا کہ آگے چل کی بیان ہوگا۔ اس کا ہمارے ساتھ آنا ہماری مشکلات میں اضافہ کرنے کے سوا اور کسی کام نہ آیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ تو افغانستان میں ہمارے لئے اس کی وجہ سے نہ صرف جیل کا بلکہ پھانسی کا بھی خطرہ پیدا ہوگیا تھا اس کا ذکر آگے چل کر واقعات کے سلسلے کے مطابق موزوں جگہ پر کیا جائے گا۔

جماعت مجاہدین میں ہماری زندگی بالکل بیکاری میں گذرتی تھی جس سے ہمارے دل تنگ ہونے لگے تھے۔ کبھی کبھی چھپ چھپا کر مجاہدین کے لوگ ہری پور سے اخبارات لے آیا کرتے تھے اس سے جنگ کی رفتار اور لڑائی کے واقعات کا ہم کو کچھ پتا چل جاتا تھا۔ اس دل تنگی کے باوجود بھی ہم میں اتحاد اور اتفاق موجود تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ اچھا گزارہ کرنا ہمارا شعار تھا۔ اگرچہ اکثر ایسے دنوں میں جب کبھی کوئی بدنی اور دماغی مصروفیت نہ ہو تو انسانوں کی ایک دوسرے سے مشکل ہی نباہ کرتی ہے۔ سردی کے دن تھے۔ ہم دن دھوپ میں بیٹھ کر کاٹا کرتے اور رات کو کوٹھڑی میں چولہے کے ارد گرد جمع ہوکر مجاہدین کے اس وفد کے واپس آنے کے دنوں کو، جو ہمارے لئے اجازت لینے کی خاطر کابل گیا ہوا تھا، گنا کرتے تھے۔ مارچ کا مہینہ شروع ہوا تو ہندوستان سے آئے ہوئے اخبارات سے معلوم ہوا کہ اتحادیوں نے درہ دانیال پر حملے کی تیاریاں شروع کردی ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی بیڑے نے ہلہ بول کر اور درہ دانیال کے ترکی مورچوں کو گولہ باری سے خراب کرکے بحیرہ مرمرا (Marmara sea) کی طرف پیش قدمی کرنا چاہی تا کہ دارالخلافہ استنبول (قسطنطنیہ) کو فتح کرکے ترکوں کو جداگانہ صلح پر مجبور کردیں۔

کابل کو روانگی:

یہ جان گداز خبریں پہنچ ہی رہی تھیں کہ مجاہدین کا وفد ہمارے لئے کابل جانے کی اجازت لے کر واپس اسمس پہنچا اور ہمارے کابل جانے کا انتظام ہوگیا۔ اس کے لئے ہم کو ایک سرحدی رہنما دیا گیا۔ یہ شخص سرحدی علاقہ کے راستوں سے واقف تھا۔ اس کا نام (حقیقی یا نام مستعار) عبدالرحمن تھا۔ ہم اس کو ملا یا کبھی کبھی عزت کے لیے مولوی کہا کرتے تھے۔ اس کی مذہبی تعلیم تو صفر تھی لیکن جیسا کہ اس زمانے میں سرحد اور افغانستان میں دستور تھا کہ جس کسی نے (کنزومنیہ) پڑھ لیں، وہی مُلاّ، مولوی اور امام بن جاتا تھا اور ہر کوئی اس کا احترام کرتا تھا اور اس کا ہاتھ چوم کر عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ ہمارے رہنما کو کچھ اردو بھی آتی تھی، اس لیے راستے میں اس سے بات چیت کرنے میں ہمیں چنداں مشکل نہ ہوئی۔

ہم 19 مارچ 1915ء کو اسمس سے روانہ ہوئے۔ یہاں ہمیں 17 مارچ 1915ء کے اخبارات مل گئے تھے، جس سے معلوم ہوا تھا کہ اتحادی جنگی بیڑوں نے جن میں انگریز زرہ پوش (کوئین الزبتہ) اور فرانسیسی جنگی جہاز گولیوس (Gaulios) جیسے بڑے بڑے سفائن حرب شامل تھے، نے درہ دانیال میں متحد ہوکر گھسنے کی کوشش کی ہے۔ ہم سب کو اس خبر سے انتہا درجے کی پریشانی ہوئی کیونکہ ان کی کامیابی کی صورت میں دارالخلافہ قسطنطنیہ (استنبول) پر اتحادیوں کا قبضہ ہوجانا یقینی بات تھی لیکن اس وقت ہم ترکوں کے لیے دعا کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوا ان کی اور کیا مدد کر سکتے تھے؟ ہم بنیر اور سوات کے علاقوں سے گزر کر 22 مارچ 1915ء کو باجوڑ کے سب سے بڑے گاؤں پہنچے جس کو کلی کہتے تھے۔ وہاں جاتے ہی ہم نے اخبار تلاش کیا۔ اخبار سے معلوم ہوا کہ انگریزی اور فرانسیسی بیڑوں نے 18 مارچ 1915ء کو درہ دانیال میں سخت شکست کھائی اور فرانسیسیوں کے گولیوس اور بووے (Bouvet) جیسے مشہور جنگی جہاز اور انگریزوں کے ارزیسٹ ایبل انڈیفٹیگ ایبل (Irresistible and indefatigable) جیسے زرہ پوش جہاز ترکی توپوں کی گولہ باری سے بحری سرنگوں سے ٹکرا کر ڈوب گئے۔

آخرکار اتحادیوں کے جنگی جہاز درہ دانیال کی مہم سے دست بردار ہوکر واپس ہوگئے۔ اس خبر سے ہمیں جو خوشی ہوئی، اس کو بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ ہم نے بارگاہِ رب العزت میں سجدۂ شکر ادا کیا اور تین دن کی بے چینی سے نجات پائی۔

سرحدی علاقے سے گزر کر افغانستان پہنچنے کے لئے ہم نے انگریزی چوکیوں سے بچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ کافی دشوار گزار تھا۔ ہم شاہراہوں سے دور رہنے پر مجبور تھے، اس لئے ایسے پہاڑی راستوں پر چلتے تھے جو صرف پیدل چلنے کے لئے ہی موزوں تھے۔ ایسے راستوں سے بکری کے سوا اور کوئی جانور بھی نہ گزر سکتا تھا۔ گھوڑے اور خچر چلنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ مگر ہم کو ایک جگہ مجبوراً اس سڑک پر چلنا پڑا جو دیر کے علاقے سے گزر کر مالاکنڈ وغیرہ کو جاتی ہے۔ یہاں انگریزوں کے پڑولوں اور سنتریوں سے ٹکرا جانے کا اندیشہ تھا، لیکن خدا کی شان کہ اس روز بارش ہوگئی اور ہم نے کوئی انگریز سپاہی نہ دیکھا۔ انہیں دنوں نواب دیر اور خان باجوڑ کے درمیان باہمی اختلافات بڑھ جانے کی وجہ سے جنگ ہوچکی تھی۔ اس لڑائی میں طرفین کے بہت سے لوگ مارے جاچکے تھے۔ جب ہم باجوڑ کے علاقے سے گزر کر دیر میں داخل ہوئے تو ہم نے ان مردوں کو دیکھا جو بغیر کفن اور دفن کے میدان میں اور راستے کے کنارے پڑے ہوئے تھے۔ چونکہ ہم نے اپنی ساری عمر میں کبھی اس سے پہلے ایسا خوفناک نظارہ نہ دیکھا تھا، اس لئے ہم سب کا دل خراب ہوا اور جی متلانے سے قے سی آنے لگی لیکن زیادہ طبیعت بگڑنے سے پہلے ہی ہم اس علاقے سے نکل گئے۔

سرحدی علاقے کا سفر دس دن جاری رہا۔ رات کو ہم مسجدوں میں سویا کرتے اور گاؤں والوں کے مہمان بنا کرتے تھے۔ اکثر مکئی کی روٹی یا دلیا کھانے کو ملتا تھا۔ گاؤں والوں کو دفعۃً 14 یا 15 آدمیوں کو مہمان بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ سرحدی مسلمانوں کی مہمان نوازی ہی تھی جو اس کا بار برداشت کرسکتی تھی۔ مسجدوں میں فرش اکثر دھان کے پھوس یا پرالی کا ہوتا تھا مگر بعض مسجدوں میں اس پر ایک بوریا بھی بچھا ہوا دیکھا گیا، لیکن اس میں اتنے پسو ہوتے تھے کہ رات کو باوجود دن بھر کی تکان کے یہاں سونا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ایک رات تو مجھے یاد ہے کہ جب ہم مہمند کے علاقے میں ملا صاحب (بابڑہ) کی مسجد میں اترے تو آدھی رات کو ایک شخص کے رونے جیسی آواز میرے کان میں آئی۔ آنکھ کھول کر دیکھا کہ بے چارہ عبدالرشید پسوؤں کے کاٹنے کی وجہ سے جاگ اٹھا تھا۔ بدن کھجلاتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔

سرحدوں کے علاقوں کے لوگوں کی مہمان نوازی کا ثبوت تو ہم دیکھ چکے تھے، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لئے گھر سے نکلے ہیں تو وہ ہمارا تہہ دل سے خیر مقدم کرنے لگے اور جہاد کے شوقین ہونے کا ثبوت دینے لگے۔ ہماری ایسی بڑی ٹولی کو دیکھ کر وہاں ہر شخص تجسس کرتا اور پوچھتا کہ یہ کون ہیں؟ جب ہمارا رہنما ان کو کہتا ''غزاوہ پارہ راغلو'' (یعنی ہم لوگ جہاد کے لئے آئے ہیں) تو سب کے چہرے بشاش ہوجاتے اور وہ سب ہم سے گلے ملنے لگتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راستے میں ہم نے جتنے لوگ دیکھے، وہ سب ہتھیار بند تھے۔ ان کے کندھے پر ایک بندوق ضرور ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ بہت جنگجو ہیں اور ہتھیاروں کے دلدادہ ہیں۔ ان کو انگریزی حکومت سے اتنی دشمنی تھی کہ اس سے لڑنا ثواب سمجھتے تھے۔ ملک میں جب کوئی حکومت نہ ہو تو ہر کوئی خود اپنی حفاظت کا سامان بہم پہنچانے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ ہتھیار بند رہیں اور نشانہ بازی سیکھیں۔ ہم نے راستے میں اس کے متعلق ایک دلچسپ قصہ سنا۔

کہتے ہیں کہ ایک قبیلہ کے ملک (یعنی سردار) نے اپنے بیٹے کو نشانہ بازی سکھانے کے لئے ایک استاد رکھا۔ جب اس نے لڑکے کو سب ہنر سکھائے تو ملک کے سامنے امتحان کی تیاری کی گئی۔ لڑکے کو جس کی عمر سات آٹھ سال کی تھی، نشانہ لگانے کو کہا گیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے استاد پر بندوق سیدھی کرلی۔ استاد نے پریشان ہوکر ملک صاحب سے کہا کہ لڑکے کو منع کرو لیکن ملک صاحب نے جواب دیا کہ: ”نہیں میں اس کو منع نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اس کا پہلا نشانہ ہے۔ اگر خطا گیا تو اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور وہ پھر کبھی ہدف کو نہ مار سکے گا۔“

پاکستان بننے کے بعد تو یہ حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اب نہ کوئی غیر یا کافر حکومت ان پر قابض ہے اور نہ ان کے علاقے میں بدامنی ہے۔ وہاں کی آبادی کی تعلیم اور ان کے گزارے کے لئے انتظامات ہورہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ لوگ تعلیم پانے کے بعد خود بخود ہتھیار بندی کو ختم کردیں گے جیسا کہ دنیا کے دیگر قبائل نے ترک کردیا ہے۔ یہ لوگ بڑے ایماندار مگر سادہ لوح ہیں اور صدیوں سے علم سے بے بہرہ ہیں۔ ان کا اسلامی جذبہ جس کی وجہ سے وہ سالہا سال سے انگریزوں کی دست برد سے اپنی آزادی کو محفوظ رکھ سکے ہیں، قابلِ قدر ہے۔ میں ان کی سادہ لوحی کا ایک واقعہ یہاں بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہم نے افغانستان جاتے ہوئے ایک روز دن بھر کی کٹھن منزل کے بعد عصر کے وقت ایک مسجد میں جاکر قیام کیا اور ہم میں سے ہر کوئی اپنی حمائل شریف کو نکال کر تلاوت کلام اللہ میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ایک آدمی مسجد میں آیا اور اس نے ہمیں ”استرہ ماشہ“ (پشاور اور کوہاٹ کے لوگوں کی زبان کے مطابق ”تھکے نہ تھیویں“) کہا۔ ہم نے اس کا جواب جیسا کہ ہم کو سکھلایا گیا تھا ”خوار ماشہ“ (آپ ذلیل نہ ہوں) کہہ کر دیا۔ اس پر وہ آدمی ہم سے پشتو میں گفتگو کرنے لگا۔ لیکن جب اس کو کسی نے بھی جواب نہ دیا تو وہ بہت برہم ہوا اور ہماری خاموشی کو اپنی بے عزتی سمجھ کر ہم سے لڑنے کو تیار ہوگیا۔ اس پر ہمارے رہنما نے اس کو بتایا کہ یہ لوگ پشتو نہیں سمجھتے اس لئے آپ کے سوالات کے جوابات نہیں دیتے۔ اس نے بڑی تعجب سے پوچھا: ”اگر یہ لوگ پشتو نہیں جانتے تو قرآن شریف کیسے پڑھ رہے ہیں؟“

یہ بے چارہ سیدھا سادہ مسلمان یہی خیال کرتا تھا کہ قرآن شریف پشتو زبان میں ہے اور جو کوئی قرآن شریف پڑھ سکتا ہے وہ پشتو بھی ضرور بول لیتا ہے۔ یہ صرف ایک شخص ہی کا قصہ نہیں ہے۔ بلکہ جب ہم اس طرح راستے میں سرحدی راہ گزروں سے ملتے تھے اور ان کو ان کے رواج کے مطابق ”السلام علیکم“ کی بجائے ”استرہ ماشہ“ کہتے تھے یا وہ خود ہم کو اس طرح خطاب کرتے تھے اور وہ ہمارے جواب میں یا ہم ان کے جواب میں ”خوار ماشہ“ بولتے تھے تو اس پر وہ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنا چاہتے تھے۔ ہماری پشتو تو یہاں ختم ہوجاتی تھی۔ اس پر وہ تعجب کرنے لگتے تھے کہ ہم ان کو جواب کیوں نہیں دے رہے ہیں؟ وہ ایسی حالت میں بعض اوقات چیں بہ جبیں ہوجاتے تھے اور جب ان کو بتلایا جاتا کہ ہم لوگ پشتو نہیں جانتے تو وہ کہتے کہ ”استرہ ماشہ“ اور ”خوار ماشہ“ کیسے جانتے ہیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرحدی لوگوں کا گزارہ زیادہ تر کھیتی باڑی ہے لیکن اتنی قابل کاشت زمینیں بہت کم ہیں۔ کیونکہ ملک بالکل پہاڑی ہے۔ مگر وہ لوگ بہت محنت کش ہیں۔ اگر ان کو پہاڑ کے دامن میں یا کسی پہاڑ کے پہلو پر یا کسی ٹیلے کی چوٹی پر چھوٹا سا قابلِ کاشت زمین کا ٹکڑا مل جائے تو وہ اس کی آبیاری کے لئے بہت دور دور سے ندیوں اور نالوں کے پانی کو پہاڑوں کے کنارے کنارے جوئی یعنی نالی کھود کر اپنے کھیت تک لے آتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں کنواں کھودنا تو محال ہی ہے، اس لئے دریاؤں اور نالوں کے پانی سے جتنا زیادہ ممکن ہوسکتا ہے، فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب آبیاری کے لئے بنائی ہوئی ان نالیوں کے پانی کو وادی کے ایک طرف سے دوسری طرف لے جانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ جفاکش لوگ درختوں کے لمبے لمبے تنے کاٹ کر ان کو بیچ میں سے دو حصوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آرے کے ساتھ کاٹ لیتے ہیں اور ان دو حصوں میں اپنے ابتدائی بڑھئی کے اوزاروں کے ذریعے نالی بنا لیتے ہیں اور ان تنوں کو وادی کی ایک طرف سے دوسری طرف تک بچھا کر یا لکڑی کے ستون کے سہارے پر وادی کی دوسری طرف بھی پہاڑیوں کے کنارے کنارے نالیاں کھود کر پانی اپنے کھیتوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس میں تعجب یہ ہے کہ یہ لوگ باوجود ان پڑھ ہونے کے انجینئروں کی مانند نالیوں کو ایسی اچھی طرح پر ڈھلوان بناتے ہیں کہ پانی نہ کہیں رکتا ہے اور نہ کہیں زیادہ تیزی سے بہتا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان نالیوں کو کسی اوورسیئر یا انجینئر نے اپنے لیول (Level) سے ماپ ماپ کر بنایا ہے۔

جن سرحدی علاقوں سے ہم گزرے، ان میں سے اکثر سرسبز تھے۔ ان میں سے سوات کا علاقہ سب سے زیادہ زرخیز معلوم ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کے پاس کاشت کاری کے لئے کافی زمینیں تھیں، چونکہ وادیاں چوڑی اور ندیاں بڑی بڑی تھیں۔ اگر ان علاقوں میں اچھی سڑکیں بن جائیں تو یہاں سیاحوں کے لئے کافی جان افزا اور دل افروز منظر موجود ہیں۔ (میں نے بعض پاکستانی رسالوں میں سوات میں نئی بنی ہوئی سڑکوں کے فوٹو دیکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان دور افتادہ اور محنت کش مسلمانوں کو بھی تہذیب کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل گیا ہے) سات دن کے سفر کے بعد ہم چمرکنڈ کے گاؤں میں پہنچے جو افغانی سرحد کے نزدیک ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ (یہاں کچھ سال بعد مولوی عبدالرحیم معروف بہ مولوی بشیر شہید نے جماعت مجاہدین میں پہنچ کر مجاہدین کی ایک ٹولی کو آباد کیا تھا اور اس کو مجاہدین کا مرکزِ ثانی بنادیا تھا۔)

اس سفر میں ہمیں کافی مشکلات کا سامنا ہوا۔ دن بھر کی تکان کے بعد جو گاؤں کی مسجد میں رات گزرتی، اس سے پچھلے دن کی درماندگی چنداں دور نہ ہوتی تھی کہ اگلے دن پھر روانہ ہونا پڑتا تھا۔ شکر ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی راستے میں بیمار نہ ہوا اور نہ کسی کے پاؤں میں چھالے پڑے۔ شجاع اللہ جس کا جسم بھاری بھرکم تھا راستہ میں قافلے میں سب سے پیچھے رہ جایا کرتا تھا اور بمشکل دن کے سفر کو پورا کیا کرتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک کمبل اور دو تین جوڑے کپڑوں کے تھے۔ میرا سامان ساتھیوں کے سامان سے ذرا زیادہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں شجاع اللہ سے آگے ہی رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے سارے دوست شجاع اللہ کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اب ہم افغانی سرحد کے قریب پہنچ گئے تھے اور اگلے روز افغانی علاقے میں داخل ہونے والے تھے۔

چمرکنڈ کے بعد ہم افغانی سرحد کی طرف بڑھے۔ اس سرحدی علاقے میں جنگلات کافی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن اور چوٹیاں سرسبز ہیں۔ درخت اتنے زیادہ ہیں کہ سورج کی روشنی بمشکل زمین پر پڑتی ہے، مگر چمرکنڈ سے لے کر افغانی سرحد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک اور سرحدی پہاڑوں کے گزرنے کے بعد بھی دور تک کسی گاؤں کا نام و نشان نہ تھا۔ اس سنسان پن کے باوجود بھی پہاڑوں کا منظر درختوں کی وجہ سے بہت دلفریب تھا۔ اس روز کچھ تھوڑی سی بارش بھی ہوگئی تھی۔ راستہ میں ہمیں کوئی افغان نہ ملا۔

آخرکار ہم دریائے کنڑ کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہاں معلوم ہوا کہ جلال آباد جانے کے لئے جو افغانستان کے ''سمت مشرقی'' نام صوبے کا سب سے بڑا شہر اور مرکز ہے اور جہاں سردی میں حکومت کے اراکین کے ساتھ آکر امیر افغانستان رہا کرتا ہے اور جو پشاور سے کوئی 60 میل کے فاصلے پر ہے، نہ کوئی اچھی سڑک ہے اور نہ ہی کسی قسم کی باربرداری کا وہاں انتظام ہوسکتا ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے صرف یہ ممکن ہوسکتا تھا کہ مشکوں کو پھلا کر اور ان کو لکڑی کے ایک چوکھٹے کے نیچے باندھ کر ایک بھدی سی ناؤ بنائی جائے جس کو افغان جالا کہتے ہیں۔ اس جالے کے نہ چپو ہوتے ہیں نہ Rudder اس لئے پانی کی رو اس کو جس طرف لے جائے، اس کی سواریاں بھی اس طرف جانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ صرف جالے والے کے ہاتھ میں ایک موٹا اور لمبا سا لٹھ ہوتا ہے جس سے وہ جالے کو کنارے سے دھکیل کر منجدھار میں لانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

دریائے کنڑ کا پانی بارشوں اور برفوں کے پگھل جانے سے اپنے معمولی حجم سے کہیں زیادہ ہوچکا تھا۔ دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ہم خدا پر بھروسہ کرکے اس جالے پر سوار ہوئے اور اپنے کو دریا کے حوالے کردیا۔ جالا جب منجدھار میں آتا تھا تو بہت تیزی سے بہتا تھا۔ اگر کہیں پانی کے زور سے کنارے پر لگا یا ریگ اور کیچڑ میں دھنسا تو اس کو پھر وہاں سے نکالنا بہت مشکل ہوجاتا تھا۔ ایک جگہ تو پانی کے بہت تیزی سے پتھریلی زمین پر بہنے کی وجہ سے ایک گرداب میں آگر اس کے الٹنے کا بھی خطرہ پیدا ہوگیا تھا جس سے ہم میں سے اکثر کے کپڑے بھیگ گئے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ جالے کا توازن زیادہ نہ بگڑا، ورنہ ہم سب دریائے کنڑ کی نذر ہوجاتے۔ ہم میں سے تیرنا تو صرف ان ہی کو آتا تھا جو کالج کی کشتی رانی Boatrace میں شریک ہوا کرتے تھے اور ان کی تعداد صرف دو یا تین تھی۔ دوپہر کے بعد ہمارا جالا جلال آباد سے چند میل کے فاصلے پر کنارے لگا اور ہم وہاں سے اتر کر پیدل جلال آباد کی طرف روانہ ہوئے۔

جلال آباد میں ورود:

شام کو جلال آباد پہنچ کر شہر کی کارواں سرائے میں قیام کیا۔ اس سرائے کو افغان رباط کہتے ہیں اور وہ شہر کی چاردیواری کے باہر واقع ہے۔ افغانستان میں پرانے زمانے سے ہر منزل پر ایسی سرائیں (رباطین) موجود ہیں۔ یہ مٹی کی عمارتیں ہیں جن کے چاروں کونوں پر ایک ایک برج اور چھت کے کنارے دیواروں میں جھروکے بنے ہوتے ہیں۔ افغانستان میں ڈاکہ زنی کے خطرے کی وجہ سے یہ عمارتیں ایک قلعہ کی طرح بنی ہوئی ہیں۔ قافلہ جب رباط میں آکر اترتا ہے تو اپنے گھوڑے، گاڑیاں اور سامان کو اندر لے جاکر رات کو اس کا بھاری بھرکم دروازہ بند کردیتا ہے۔ عمارت کے اندر ایک بڑا سا صحن ہوتا ہے اور اس صحن کے دو کناروں پر مسافروں کے سونے کے لئے چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں ہوتی ہیں جن میں نہ کوئی کھڑکی اور نہ دروازے کے سوا روشنی آنے کا انتظام ہوتا ہے۔ صحن کے باقی دو کناروں پر اصطبل ہوتے ہیں جن میں قافلہ اپنے گھوڑے اور خچروں کو باندھ دیتا ہے۔ صحن کے بیچ میں ایک چبوترہ اور اس کے آخر میں ایک جگہ ہوتی ہے جو نماز پڑھنے کے لئے مسجد کا کام دیتی ہے۔ رباط کا دربان دروازے کے پاس والے کمرے میں رہتا ہے۔ اسی کے قریب ایک جو اور گھاس بیچنے والے کی، ایک چائے فروش کی دکان ہوتی ہے جو سبز چائے، خشک میوہ، پنیر اور خمیری روٹی بیچتا ہے۔ قافلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والے یا تو یہاں سے کچھ کھانے کی چیزیں لے لیتے ہیں یا خود اپنی روٹی اور سالن پکا کر کھا لیتے ہیں اور اندھیری کوٹھڑیوں میں رات کو سو رہتے ہیں۔ پانی صحن میں موجود ایک کنویں سے لیا جاتا ہے۔ اگر اس کا پانی نمکین ہو تو پاس کی کسی ندی سے لیا جاتا ہے مگر یہ پانی مضرِ صحت ہوتا ہے، اس لئے افغانستان کے شہروں میں پانی کی بجائے چائے کا بہت رواج ہے کیونکہ چائے بنانے کے لئے یہ پانی ابال لیا جاتا ہے اور اس طرح جراثیم سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ رباط میں صبح سے شام تک سماوار (بڑی چائے دانی) میں پانی ابلتا رہتا ہے اور جب کوئی مسافر پہنچے تو فوراً چائے فروش چائے کی پتیاں چھوٹی چائے دانی میں ڈال کر ان میں ابلتا ہوا پانی بھر دیتا ہے اور دم ہونے کے لئے اس چائے دانی کو یا سماوار کے اوپر یا آگ کے نزدیک رکھ دیتا ہے۔ جب پانی کا رنگ زرد ہو جائے تو چائے پیالی میں ڈال کر ایک دفعہ تو میٹھی پی جاتی ہے اور اس کے بعد سب پیالیاں پھیکی پی جاتی ہیں۔ افغانی گھروں میں جب مہمان کو چائے دی جاتی ہے تو اسی قاعدہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قند (شکر) کی کفایت شعاری اور بچت کے لئے اس طرح کیا جاتا ہے۔ ایک میٹھی پیالی کے بعد سب پیالیاں بغیر قند کے دی جاتی ہیں اور جب تک مہمان پیالی الٹی نہ کرے یا اس پر اپنا چمچہ نہ رکھ دے، صاحب خانہ اس کی پیالی میں چائے ڈالتا جاتا ہے۔ ہمیں چونکہ شروع میں اس قاعدہ کی خبر نہ تھی اس لئے ایک دو دفعہ چار و ناچار چند ایک پھیکی پیالیاں پینی پڑی تھیں۔

رباطیں عام طور پر بہت میلی اور گندی ہوتی ہیں جن میں صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اپنی کوٹھڑی خود صاف کرتا ہے اور وہاں رات گزار کر اس کو میلی کچیلی چھوڑ کر اگلے پڑاؤ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نیا قافلہ آ کر ان کوٹھڑیوں میں جھاڑو وغیرہ دیتا ہے۔ افغانستان میں بھنگی نہیں ہوتے، اس لئے پاخانوں کی صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہر گھر میں پاخانہ چھت پر ہوتا ہے اور گندگی ایک سوراخ دار نالی سے نیچے کی منزل میں گرتی ہے اور کنویں کی مانند ایک جگہ جس کی ایک کھڑکی ہوتی ہے، جمع رہتی ہے۔ شہروں میں خرکار (گدھے لادنے والے) آ کر اس کھڑکی سے کبھی کبھار گندگی نکال کر لے جاتے ہیں۔ اس لئے شہروں میں بدبو اور تعفن بہت ہے۔ گلیاں تنگ و تاریک ہونے کی وجہ سے یہ بدبو اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہم نے جلال آباد میں رات رباط میں گزاری اور صبح کو جلال آباد شہر کے اندر جا کر اخبار تلاش کیا لیکن یہاں کوئی شخص بھی اخبار کا شوقین نہ ملا۔ اس وقت افغانستان میں صرف ایک ہفتہ وار فارسی اخبار نکلتا تھا جو ٹائپ سے چھپتا تھا اور باتصویر تھا۔ اس اخبار کا نام سراج الاخبار تھا۔ سرکاری ملازمین اس اخبار کو خریدنے پر مجبور تھے۔ اس کا چندہ ان کی تنخواہوں سے کاٹ لیا جاتا تھا۔ جلال آبادی اکثر ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اور لوگ عام طور پر پشتو گو ہونے کے سبب سے سراج الاخبار کو کوئی زیادہ نہ پڑھتا تھا اور بازار میں اخبار نہ بکتا تھا، اس لئے ہم جنگ کے متعلق کوئی تازہ خبر حاصل نہ کر سکے۔ ہم جب لوگوں سے پوچھتے کہ جنگ کے بارے میں تازہ خبریں کیا ہیں؟ تو وہ جواب دیتے تھے: ''بلے! مقدمہ ہست'' (یعنی جنگ جاری ہے)

لوگوں کے اس قسم کے جواب سے ہمیں تعجب بھی ہوا اور مایوسی بھی۔ ہم نے امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ افغانستان ہندوستان کی آزادی میں مدد دے گا اور انگریزوں سے لڑے گا۔ یہاں آ کر دیکھا کہ کسی کو جنگِ عظیم کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں۔ لوگ بالکل دنیا ومافیہا سے بے خبر ہیں۔ ہم نے خط لکھنے کے لئے کاغذ اور لفافے تلاش کئے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم، دوات یا پنسل بکتی ہو۔ ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دکان پر بکتے ہیں مگر قلم اور دوات بیچنے والا کوئی نہیں ہے۔

ہمارے جلال آباد پہنچنے کے دوسرے دن ہمارے سردار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبدالمجید خان ہمارے بھاری سامان کو، جو پشاور کے راستہ خفیہ طور پر افغانستان کے سرحدی قصبے (ڈکہ) کو جماعت مجاہدین کے ذریعے بھیجا گیا تھا، جلال آباد لانے کے لئے (ڈکہ) گئے۔ جلال آباد اور ڈکہ کے درمیان سڑک چنداں اچھی نہیں۔ علاقہ غیر آباد ہے اور بے درخت ٹیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ گرمی سخت پڑتی ہے، پانی ندیوں اور نالوں کا پیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں اس پانی کے جراثیم سے ان کو ٹائیفائیڈ ہوا اور جب وہ چار دن کے بعد واپس جلال آباد آئے تو ان کو سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔

ان کے ڈکہ کی روانگی کی شام کو ہم اکٹھے ہوکر ذرا رباط سے باہر شہر کی طرف ہوا خوری کو گئے تو راستہ میں ہم نے ایک اچھے گھوڑے پر ایک شخص کو سوار دیکھا جس کے ساتھ چند ایک رسالہ کے سوار اردلی کے طور پر تھے۔ اس نے ہمیں پاس بلا کر ہمارے حالات دریافت کرنا شروع کئے۔

یہ شخص شاہ آغائی علی احمد خان جو بعد میں شاہ امان اللہ خان کا بہنوئی بنا اور 1929ء میں بچہ سقا کی بغاوت کے زمانے میں قندھار کا گورنر تھا، اس نے امیر امان اللہ خان کی حمایت کی اور بچہ سقا کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بچہ سقا کے ہاتھ قیدی بنا اور اس کے حکم سے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ شاہ آغائی امیر دوست محمد خان یا شاہ شجاع کے ساتھ امیر وقت کے ڈر سے کابل سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہوا تھا، اس لئے اردو بول سکتا تھا۔ اس نے ہم سے اردو میں گفتگو کی اور جب اس کو معلوم ہوا کہ ہم جہاد کے لئے افغانستان میں ہجرت کر کے آئے ہیں تو اس نے ہماری بہت دلداری کی۔ ہم اس سے مل کر بہت خوش ہوئے لیکن اس نے جو باتیں ہمارے منہ پر کہی تھیں وہ اس کے بعد کے طرزِ عمل کے بالکل برخلاف نکلیں اور وہ ریاکار ثابت ہوا۔

ہم رات کو رباط آ کر سو رہے لیکن صبح کے قریب جب رحمت علی اور عبدالرشید وضو کے لئے رباط سے باہر نکلنے لگے تو ان کو ایک سپاہی نے جس کی بندوق پر سنگین (برچھی) لگی ہوئی تھی، روکا اور سنگین کو ان کی طرف پھیر کر بہت غصے سے کہا:

''موقوف است، بیرون برآمدہ نمی توانی۔'' (یعنی تمہارے لئے باہر جانا منع ہے)

یہ بے چارے ڈر کر پریشانی کی حالت میں واپس آئے۔ جب دن نکلا تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب نظربند ہیں اور ہم پر ہتھیار بند سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ ایشیک آقائی (شاہ آقائی) نے، جس نے ہندوستانی اخباروں سے ہمارے ہندوستان سے نکلنے کی خبریں بھی پڑھ لیں تھیں اور ہمارے متعلق لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے یہ الفاظ بھی دیکھ لئے تھے جس سے اس نے موت کا فتویٰ دیا تھا: If any one of them is caught, he shall be hanged by the first tree on the borders of India. (یعنی اگر ان میں سے کوئی پکڑا گیا تو اس کو ہندوستان کی سرحد پر سب سے پہلے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے گی)

اس کے باوجود بھی غالباً شاہ آغائی نے ہمیں انگریزوں کا جاسوس سمجھا اور ہمیں سپاہیوں کے حوالے کردیا۔ یہاں سے ہماری وہ نظربندی شروع ہوئی جو چار سال یعنی 1919ء میں امیر حبیب اللہ خان کے قتل تک جاری رہی اور جس کی وجہ سے ہم میں سے بعض دوستوں نے (جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا) افغانی سپاہیوں سے مکہ بازی بھی کی اور اس وجہ سے قید میں پڑے۔

اس نظربندی کے زمانے میں ہم نہ کسی سے راستہ میں بات کرسکتے تھے اور نہ کسی کے ہاں جاسکتے تھے اور نہ ہی کوئی ہمارے ہاں آسکتا تھا۔ اگر ایک دوست بازار میں خرید و فروخت کے لئے جاتے تو ایک سپاہی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اگر وہ راستہ میں کبھی کسی سے بات کرتے تو سپاہی فوراً دخل دے کر ''موقوف است'' (یعنی منع ہے) کہہ کر ان کو روک دیتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھا۔ خلاصہ کلام، چار سال تک افغانی سپاہی ہمارے ساتھ سایہ کی طرح موجود رہے۔ اگر شاہ آغائی ہمارے متعلق حکام بالا کو کوئی اچھی رپورٹ دیتا تو شاید ہمارے ساتھ اس قسم کا سلوک نہ ہوتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں افغانی گورنمنٹ میں انگریز پرستی اتنی تھی کہ ہمارے لئے کوئی بھی شفاعت کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا، اس لئے کابل چل کر بھی ہمیں آزادی نہ ملی۔ اگر بادشاہ یا اُمرا درحقیقت ہمارے ہمدرد ہوتے اور انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے ہم پر پابندیاں نہ لگاتے تو شاید شاہ آغائی کی رپورٹ کے باوجود بھی ہم کو کابل میں آزادی مل جاتی۔

لیکن اس چار سالہ نظربندی کے زمانے میں کبھی افغانوں نے ہمارے منہ پر یہ نہ کہا کہ آپ قید یا نظربند ہیں۔ بلکہ وہ ہمیشہ ہم کو ''شما مہمان شاہی ہستید'' (آپ بادشاہ کے مہمان ہیں) کہا کرتے تھے اور اس طرح اپنی ریاکاری کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

عبدالمجید خان کے ڈکہ سے واپس آنے کے ایک روز بعد ہم کو شاہ آقائی کے حکم سے سپاہیوں کی نگرانی میں کابل بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ اس کے لئے ہر شخص کو اپنا سامان لادنے اور سامان کے اوپر چڑھ بیٹھنے کے لئے ایک ٹٹو یا خچر دیا گیا۔ ان ٹٹوؤں اور خچروں پر زین کی بجائے پان لگا ہوا تھا، جس پر ہر کوئی اپنا اپنا سامان لاد کر اس سامان کے اوپر خود بھی سوار ہونے پر مجبور تھا۔ اس طرح ہمارے جیسے پڑھے لکھے یونیورسٹی کے طالب علم اور ''مہمان شاہی'' اس ہیئت کذائی میں ٹٹوؤں اور خچروں پر سوار ہوکر کابل روانہ ہوئے۔ کابل تک سات پڑاؤ تھے۔ عبدالمجید خان کی طبیعت بخار کی وجہ سے روز بروز خراب اور کمزور ہوتی جارہی تھی لیکن راستہ میں ٹھہرنے اور رہنے کا امکان نہ تھا، کیونکہ راستہ میں پڑاؤ پر نہ کوئی ڈاکٹر موجود تھا اور نہ کوئی دوائی مل سکتی تھی اس لئے ہم چار و ناچار سفر کرنے پر مجبور تھے تاکہ جلد کابل پہنچ کر کسی ڈاکٹر سے ان کا معالجہ کرائیں۔

کابل سے ایک منزل پہلے (بت خاک) کے پڑاؤ پر معلوم ہوا کہ کابل میں کوئی مرض پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے قرنطینہ لگا ہوا ہے اور کابل آنے جانے والوں کی سخت پڑتال کی جاتی ہے اور اگر کوئی مریض نظر آئے تو ان کو کابل میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس سے ہمیں بہت تشویش ہوئی۔ ہم نے بے چارے عبدالمجید خان کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ خود بھی تو بہت بلند ہمت تھے۔ قرنطینہ میں سے وہ بہت متبسم ہوکر ایسی جرأت سے گزرے جیسے ان کو کبھی بخار نہ آیا تھا۔

ہمارا کابل پہنچنا

خدا خدا کرکے ہم بغیر روک ٹوک کے کابل پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہاں ہم کو کوتوال شہر کے سامنے پیش کیا گیا۔ کوتوال بھی اردو بولتا تھا۔ بعض کابلیوں کی عادت کے موافق اس نے بھی ہمارے منہ پر ہماری بڑی دلداری کی اور ہم کو اپنے دفتر سے متصل ایک گھر میں، جس کا صحن ذرا بڑا تھا اور جس میں تین کمرے، باورچی خانہ اور سپاہیوں کے لئے دو کوٹھڑیاں تھیں، ''مہمان شاہی'' کے طور پر رکھا اور ہمارے گزارے کے لئے روزانہ فی آدمی ایک افغانی روپیہ (جو اس زمانے میں تقریباً 12 آنے کے برابر تھا) مقرر کیا، لیکن ہم کو باہر جانے کی چنداں اجازت نہ تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی باہر نکلے، یہاں تک کہ باہر کی جوئے (یعنی پانی کی نالی) پر وضو کو جائے تو ضرور ایک سپاہی نگرانی کے لئے اس کے ساتھ جاتا تھا۔ روٹی تو ہم بازار سے خرید لیتے تھے کیونکہ کابل میں کوئی بھی توے پر روٹی نہیں پکاتا اور سب لوگ تندور کی خمیری روٹی کھاتے ہیں، لیکن سالن ہم خود بنایا کرتے تھے۔ عبدالحمید کو ذرا ہنڈیا پکانا آتی تھی، اس لئے کھانا تیار کرنا اس کے ذمہ تھا۔ برتن دھونے کے لئے نمبر مقرر تھا اور ہر کوئی اپنے نمبر پر اپنی نوبت کے دن برتن دھو دیا کرتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند دن بعد عبدالمجید خان کے معالجے اور شجاع اللہ کو دیکھنے کے لئے ڈاکٹر اللہ جوایا ہمارے ہاں آیا۔ وہ ہمارے ہندوستان چھوڑنے پر بہت چیں بہ جبیں تھا۔ اس نے عبدالمجید خان کو جس کی حالت اس وقت بہت خراب ہوچکی تھی، کچھ دوائی دی اور ایک دو روز بعد پھر آنے کا وعدہ کیا۔ دو روز بعد جب وہ آیا تو بے چارے عبدالمجید خان بسترِ مرگ پر تھے۔ ان کو دیکھ کر اس نے کہا کہ بیمار کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ وہ تو اب صرف چند ایک گھنٹوں کا مہمان ہے۔ اس کے بعد وہ فوزا چلا گیا۔ عبدالمجید خان 19 اپریل 1915ء کو فوت ہوگئے۔ ہم نے خیال کیا کہ شاید تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے گیا ہے لیکن جب کئی گھنٹے تک بھی اس سے کوئی خبر نہ آئی تو آخرکار ہم نے کوتوال کو خبر دی جس نے ان کا جنازہ اٹھوایا۔ ان کی موت سے ہم کو جتنا صدمہ ہوا، اس کا ذکر یہاں میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔ اب ہم بالکل بے سر ہوگئے تھے اور اپنے کو اس پرائے ملک میں اور غیر لوگوں کے درمیان بالکل بے حامی محسوس کرنے لگے تھے۔

اس زمانے کا شہرِ کابل

اس زمانے میں شہرِ کابل جس کی آبادی 75 ہزار اور مضافات کے ساتھ مل کر کوئی سوا لاکھ بتائی جاتی تھی، شمال میں باغ بالا سے لے کر جو امیر عبدالرحمن خان کا بنایا ہوا ایک پرفضا باغ تھا، جنوب میں مشہور قلعہ (بالاحصار تک) جہاں انگریزوں اور افغانوں کے درمیان پرانے زمانے میں لڑائیاں ہوئی تھیں اور جہاں اعلیٰ حضرت محمد نادر خان شہید نے اپنے زمانے (1931ء) میں افغانی ملٹری کالج کی بنیاد رکھی تھی، پھیلا ہوا تھا۔ اس زمانے میں قلعہ بالا حصار خراب حالت میں تھا اور افغانی حکومت اس کو تعمیر نہیں کرتی تھی، کیونکہ انگریزوں سے جو معاہدہ کسی پرانے زمانے میں انگریزی فوجوں کے کابل سے جانے پر ہوا تھا، اس میں یہ شرط بھی تھی کہ اس قلعہ کو تعمیر نہ کیا جائے۔ شہر کے مغرب میں خواجہ رواش اور کوہ آسمائی کی پہاڑیاں واقع ہیں۔ مشرق میں چمن حضوری تھا جو امیر حبیب اللہ خان کا گولف (Golf) کا میدان تھا۔ دریائے کابل شہر کے بیچ میں سے گزرتا تھا۔ سیلاب کے وقت شہر کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کے دونوں کناروں پر تین تین گز اونچی پتھر کی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ دریائے کابل کے شمال میں جو شہر کا حصہ تھا، اس میں شاہی محلات کے سوا امیروں اور سرداروں کے مکانات اور کوٹھیاں تھیں۔ اس حصہ شہر میں سے محلّہ دہ افغاناں، محلّہ شہر آرا پایہ تخت کے خوب صورت ترین محلے مانے جاتے تھے۔ یہاں سڑکیں پختہ اور عمارتیں خوبصورت تھیں لیکن سب کی سب اونچی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی تھیں، اس لئے ان کی خوبصورتی باہر سے نظر نہ آتی تھی۔ بازار (ارگ) جو کوتوالی کے دروازے سے لے کر بازار (میوہ فروشی) تک اور وہاں سے پھر دریائے کابل کے کنارے پہنچتا ہے، اچھے مال دار تاجروں کی بڑی بڑی دکانوں سے آراستہ تھا۔ اس حصہ شہر میں دریائے کابل سے کاٹ کر لائی ہوئی کچی جوئے یعنی چھوٹی چھوٹی نہریں بہتی تھیں۔ شاہی محلات ارگ (یعنی قلعہ) کے احاطہ میں تھے۔ ان میں سے امیر حبیب اللہ خان کا محل اندرون ارگ میں تھا۔ ارگ کی دیواریں بلند اور جھروکے دار تھیں اور اس کے اردگرد ایک بہت چوڑی خندق موجود تھی۔ قصر دلکشا، کوٹھی اسٹور اور سلام خانہ جیسی شاہی عمارات ارگ کے بیرونی احاطہ میں واقع تھیں۔ شہزادوں کے محلات مثلاً زین العمارہ جس میں امیر حبیب اللہ خان کے چھوٹے بھائی سردار نصراللہ خان نائب السلطنۃ رہتے تھے اور عین العمارہ جس میں شہزادہ امان اللہ خان عین الدولہ کی رہائش تھی، شہر کے اسی حصہ میں مختلف جگہوں پر واقع تھے۔

شہر کا وہ حصہ جو دریائے کابل کے جنوب میں تھا، پرانے طرز پر بنا ہوا تھا جس کی گلیاں عام طور پر تنگ تھیں۔ اس کے بازار بھی چنداں چوڑے نہ تھے اور اکثر اوپر سے چھتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے تھے۔ مثلاً بازار پل چشتی، بزازہ، بازار پوستن دوزان اور شور بازار چھتے ہوئے بازاروں میں سے تھے۔ یہ چھتیں دکانداروں کو گرمی میں دھوپ سے اور سردی میں برف اور باران سے محفوظ رکھتی تھیں، لیکن شہر کا چوک اور اناج منڈی اوپر سے کھلی ہوئی تھی۔ چوک پر ہندو صرافوں کی دکانیں تھیں جو زیور وغیرہ رہن لے کر لوگوں کو قرض پر روپیہ دیا کرتے تھے اور سونے کے سکے جس میں بخارا اور افغانستان کی اشرفیاں اور انگریزی اور روسی پونڈ جیسے طلائی سکے شامل تھے، بنا دیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ایک انگریزی پونڈ 16 کابلی روپے کے برابر تھا۔ ان ہندوؤں کی پہچان کے لئے افغان حکومت نے (جیسا کہ اوپر بھی لکھا جا چکا ہے) زرد پگڑی باندھنے کا حکم دے رکھا تھا تاکہ لوگ کہیں غلطی سے ان کے ساتھ بدسلوکی نہ کریں۔ افغانستان میں سرحدی علاقے کی طرح ہندو دکانداروں اور صرافوں کی بہت حفاظت کی جاتی تھی۔ بزازے کے بازار میں پنجابی کپڑا فروشوں کی دکانیں تھیں۔ بازار پوستن دوزاں میں بھیڑ کی کھالوں سے سردی کے لئے گرم کوٹ اور پوستین بنائی جاتی تھیں۔

شہر کا یہ جنوبی حصہ چنداں صاف ستھرا نہ تھا۔ اس میں نہ گندگی اٹھانے کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی گھروں اور حماموں کے گندے پانی بہنے کے لئے نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسا پانی یا شہر کے اندر بڑے بڑے گڑھوں میں جمع ہوجاتا تھا یا دریائے کابل کے کنارے کے گھروں سے دریا میں مل جاتا تھا۔ کابل کا سب سے تاریک محلہ ''چنداول'' کا محلہ تھا جہاں گلیاں نہایت تنگ اور اوپر سے چھتی ہونے کی وجہ سے بالکل تاریک تھیں اور بعض جگہ تو گھروں کے نیچے سے سرنگوں کی طرح گزرتی تھیں۔ شہر کے شمالی اور جنوبی حصوں کے درمیان رفت و آمد کے لئے دریائے کابل پر شہر کے اندر مختلف جگہوں پر سات پل تھے جن میں سے مشہور یہ ہیں:

باغ بابر اور قصر چہل ستوں سے مہتاب قلعہ کو جانے والی سڑک کا پل۔ پل شاہ شمشیران جو مستوفی الممالک (وزیر مالیہ) محمد حسین کے گھر کے نزدیک تھا۔ یہ گھر بعد میں روسی سفارتخانے کے طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اس پل کے نزدیک علیا حضرت صاحبہ ملکہ اول امیر حبیب اللہ خان اور والدہ امیر امان اللہ خان نے ایک خوبصورت مسجد بنوائی تھی جو استانبول کی مسجدوں (اورتہ کوے) سے بہت مشابہ ہے۔

پل خشتی جس کے نزدیک کابل کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے اور جو کابل کے مشہور بازار سرپل میں ہے۔

پل عیدگاہ جو موجودہ وزارت حربیہ اور سول اسپتال (جس کو شفا خانہ ملکی کہتے ہیں) کے قریب ہے اور جہاں سے گزر کر لوگ سیر و تفریح کے لئے چمن حضوری (امیر حبیب اللہ خان کا گولف کا میدان) کی طرف جاتے ہیں۔ اس زمانے میں شہر میں عام سواری کا انتظام بہت کم تھا۔ امیروں کے اصطبل میں تو اچھے اچھے گھوڑے موجود تھے اور وہ اکثر اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر ہوا خوری کو نکلا کرتے تھے۔ خاندان شاہی کے افراد یا گھوڑوں اور بگھیوں میں آتے جاتے تھے۔ خود امیر حبیب اللہ خان مرحوم اکثر بگھی میں ہوا خوری کو نکل جاتے تھے۔ ان کی خواتین بھی بگھیوں میں سوار ہوتی تھیں۔ ان کے منہ پر بہت باریک کپڑے کا برقعہ ہوتا تھا جس کو وہ تنہا سڑکوں پر منہ سے بالکل اٹھا دیا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ کے سوار پہرہ دار کسی راہ رو کو اگر ان کی سیر و تفریح کی سڑکوں پر پھرتا دیکھیں تو اس کو للکار کر ''کورشو'' (یعنی آنکھیں بند کرلو) کہا کرتے تھے۔ امیر حبیب اللہ خان کبھی کبھی موٹر پر بھی نکلا کرتے تھے۔ لوگوں کو جب سواری کی ضرورت ہوتی تھی تو کرایہ پر تانگہ لے لیا کرتے تھے لیکن شہر کی اندرونی سڑکیں اتنی تنگ تھیں کہ وہاں عام طور پر گاڑی چلانا ناممکن تھا۔ شہر کے باہر کی سڑکوں کے دونوں طرف پانی کی نالیاں بہتی تھیں جن کے پانی کو سقے صبح اور شام سڑکوں پر چھڑکا کرتے تھے جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ذرا خاک اور گرد کم ہو جاتی تھی۔

کابل میں اس زمانے میں ہوٹل تو کوئی نہ تھا۔ بازار میں روٹی اور سالن بیچنے والوں کی چند ایک دکانیں تھیں۔ متوسط طبقے کے لوگ دوپہر کے کھانے کے لئے عام طور پر چائے فروش کی دکانوں پر جاتے تھے اور وہاں چائے کے ساتھ تنوری روٹی، پنیر اور کشمش کھالیا کرتے تھے۔ سرکاری دفتروں میں دوپہر کا کھانا اس زمانے میں بڑے افسروں کے لئے شاہی باورچی خانہ سے دیا جاتا تھا۔ چھوٹے کلرک (Clerk) اور ملازمین چائے، پنیر اور کشمش پر گزارہ کرتے تھے۔ شام کا کھانا غریب لوگوں کے سوا ہر کوئی پر تکلف کھاتا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگوں اور امیروں کے دسترخوان پر رات کو عام طور پر پلاؤ، گوشت، سبزی کا سالن، کھٹائی اور مربہ ضرور ہوتا تھا۔ امیر لوگوں کے دسترخوان پر کئی قسم کے پلاؤ کے خوانچے ہوتے تھے۔

افغانستان میں علاقہ کنڑ کے چاول جو جلال آباد کے صوبہ میں ہے، بہت مشہور تھے۔ یہ چاول پشاور، ڈرہ دون اور کرنال کے چاولوں کے مانند تھے۔ ان سے مختلف قسم کے پلاؤ پکائے جاتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد ہر شخص سبز چائے پیتا تھا، جس کی آخری پیالی پھیکی یعنی بغیر قند کے ہوتی تھی۔

کابل میں سخت سردی پڑتی ہے۔ عام طور پر بہت زیادہ برف باری ہوتی ہے جو کھیتوں اور فصلوں کے لئے بہت مفید ہے۔ یہاں تک کہ کابل کے لوگوں میں ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے: ''کابل بے زر باشد بے برف نباشد۔'' (یعنی اگر کابل میں سونا نہ ہو تو کوئی ڈر نہیں لیکن شہر برف سے محروم نہ رہے) گھروں کی چھتوں پر کھپریل نہ تھے بلکہ چھتیں ہموار اور مٹی کی تھیں۔ برف باری کے فوراً بعد ان کو برف سے صاف کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ برف چھتوں سے گلی کوچوں میں گرائی جاتی تھی جس سے راستوں میں برف کے ڈھیر لگ جاتے تھے۔ برف کے یہ تودے موسمِ سرما میں اسی طرح گلیوں میں پڑے رہتے تھے اور ان کو اٹھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آخر گرمی آنے پر برف پگھل پگھل کر خود ہی غائب ہو جاتی تھی لیکن برف کے اس طرح پگھلنے کی وجہ سے سڑکوں اور کوچوں میں ہر طرف کیچڑ ہو جایا کرتا تھا۔

اس زمانے میں کابل میں گھروں کو سردی کے موسم میں گرم رکھنے کا انتظام مختلف تھا۔ امیر لوگ تو بخاری لگایا کرتے تھے۔ بخاری لوہے کی چادر سے بنے ہوئے ایک ڈھول کی مانند اسطوانہ کی شکل رکھتی تھی جس کے نچلے حصے میں سامنے کی طرف لکڑی ڈالنے کے لئے ایک چھوٹی سی کھڑکی ہوتی تھی اور اوپر کے حصے میں پیچھے کی طرف ایک بڑا سا سوراخ دھوئیں کے نکلنے کے لئے ہوتا تھا۔ اس سوراخ پر لوہے کی چادر کا بنا ہوا نل لگا کر دھواں دیوار میں بنی ہوئی چمنی کے ذریعے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ بخاری میں آگ جلنے سے کمرے کی ہوا گرم ہو جاتی تھی اور انسان سردی کے مہینے میں کمرے میں آرام سے بیٹھ کر کام کاج کر سکتا تھا۔ کابل میں اس زمانہ میں پتھر کا کوئلہ نہ ملتا تھا اس لئے نہ پتھر کا کوئلہ جلانے والے اسٹوو استعمال ہوتے تھے اور نہ سینٹرل ہیٹنگ کا انتظام تھا۔ باقی لوگ اوسط درجے کے ہوں یا غریب ہوں، صندلی لگایا کرتے تھے جو صرف ہاتھ پاؤں کو گرم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ صندلی ایک پست سی چار کونی میز کو کہتے ہیں۔ اس میز کے نیچے لکڑی کا کوئلہ ایک انگیٹھی میں سلگا کر اور راکھ سے ڈھنک کر رکھ دیا جاتا ہے اور صندلی کے اوپر ایک بڑا سا لحاف ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ سب اہلِ خانہ فرش پر جس پر امیروں کے ہاں اعلیٰ قسم کے قالین اور غریبوں کے ہاں اونی دریاں جن کو گلیم کہا جاتا ہے، بچھی ہوتی تھیں، بیٹھ جاتے تھے اور ٹانگیں اس لحاف کے نیچے دراز کر کے اپنے پاؤں کو گرم کر لیتے تھے۔ اگر ہاتھ بھی ٹھنڈے ہوں تو ان کو بھی اسی لحاف کے نیچے گھسیڑ کر گرم کر لیا کرتے تھے۔ بدن کے دوسرے حصے سرد رہتے تھے، اس لئے عام طور پر کندھوں پر پوستین یا ایک اوور کوٹ ڈال لیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے تھے۔ دن میں بستر کو لپیٹ کر پیٹھ کے پیچھے گاؤ تکیہ کے طور پر سہارے کے لئے رکھ لیتے تھے۔

برف باری کے زمانے میں لوگ عام طور پر اسی طرح بیکاری اور سستی میں وقت گزارتے تھے۔ رات کو یہ گاؤ تکیہ کھول کر بستر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کنبہ کے سارے لوگ صندلی کے لحاف کے نیچے رات بسر کرتے تھے۔ ماں، باپ، بچے، بہو، لڑکے، لڑکیاں سب ایک ہی جگہ سوجایا کرتے تھے۔ سونے سے پہلے افراد خانہ اور اگر گھر میں کوئی مہمان موجود ہو تو سب مل کر صندلی کے اردگرد بیٹھ جاتے تھے اور شب چرہ یعنی پستہ، بادام، کشمش وغیرہ خشک میوہ کھاتے رہتے تھے اور مختلف قسم کی باتیں کرتے جاتے تھے۔ ایک طرف سبز چائے کا دور چلتا تھا اور دوسری طرف سے اِدھر اُدھر کی گپ بازی ہوتی رہتی تھی۔ کابل کی فارسی میں ''گپ'' کے لفظ کے معنیٰ بات چیت کے ہیں اور ایرانی فارسی میں استعمال ہونے والے ''سخن'' کے لفظ کی بجائے بولا جاتا ہے۔ جب ہم نے شروع میں کابل میں دیکھا کہ لوگ ہم کو ''گپ بزنید'' کہتے ہیں تو ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ لوگ ہم سے مبالغہ آمیز باتوں کی کیوں خواہش کر رہے ہیں؟ کیوں کہ اردو میں ''گپ'' کے معنیٰ تو مبالغہ آمیز بات کے ہیں، لیکن آخرکار معلوم ہوا کہ کابل میں اس لفظ کے معنیٰ ''بات چیت'' کے ہیں اور یہ لفظ فارسی، ایران کے لفظ ''سخن'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے اور ان کا ''گپ بزنید'' کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہم کو ''ذرا بات کرو'' کہنا چاہتے ہیں۔

اس طرح رات کے نو بجے تک جب تک کہ Curfew نہ لگے، یعنی رات کو باہر نکلنے کی ممانعت توپ چلا کر منادی نہ ہو، یہ صحبتیں جاری رہتی تھیں۔ کابل میں اس زمانہ میں عجیب دستور تھا کہ سردی میں رات کے نو بجے اور گرمی میں رات کے دس بجے توپ کی آواز سے Curfew کا اعلان کیا جاتا تھا جس کے بعد کوئی فرد واحد بھی گلی میں نہیں نکل سکتا تھا۔ صرف پہرہ دار اور ایسے لوگ جن کو ''نام شب'' یعنی Password جو ہر رات فوجی حکام کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا، معلوم ہو توپ چلنے کے بعد گلی کوچوں میں پھر سکتے تھے۔ یہ قاعدہ غالباً اس زمانے میں بدامنی کی وجہ سے جاری کیا گیا تھا۔

کابل میں گرمی زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی سارا دربار شاہی پغمان کے صحت افزا مقام کو جو کابل کے شمال میں کوئی بیس میل کے فاصلے پر دامن کوہ میں واقع ہے اور جہاں امرا کے خوب صورت بنگلے، باغات اور کوٹھیاں ہیں، چلا جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں امیر حبیب اللہ خان جلال آباد جایا کرتے تھے اور وہاں پغمان کے علاقے میں جہاں آخرکار ان کو قتل کیا گیا، شکار اور تفریح میں مصروف رہتے تھے۔

افغانستان میں اس زمانے میں (جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے) چنداں تعلیم کا رواج نہ تھا۔ کابل کے سوا کسی اور شہر میں نئے اصول کے مدرسے موجود نہ تھے۔ لوگ پرانے اصولوں پر مسجدوں میں قرآن شریف پڑھنا سیکھ لیتے تھے۔ دفتروں میں کام کرنے والے کلرک جن کو افغانستان میں مرزا کہا جاتا ہے، پرائیویٹ طور پر تعلیم یافتہ تھے جن کی عمومی معلومات جنرل نالج بہت محدود تھیں۔ نئی طرز کی تعلیم امیر حبیب اللہ خان کی سیاحت ہندوستان کے بعد، جو انہوں نے 1905ء میں کی تھی، شروع ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان سے مولوی عبدالغنی اور ان کے بھائی چراغ دین اور مولوی محمد حسین خان علیگ جیسے معلمین کو کابل بلا کر ''مکتب حبیبیہ'' قائم کیا تھا۔ بعد میں ان صاحبوں اور بعض افغانوں پر افغانستان میں جمہوری حکومت Constitutional Govermment قائم کرنے اور امیر حبیب اللہ خان کو تخت سے اتارنے کی سازش کا الزام لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانی سازشیوں میں سے بعض کو موت کی سزا دی گئی اور ان کو توپ سے اڑا دیا گیا، بعض کو عمر قید کی سزا ملی۔ انہی میں سے ایک شخص وزیرستان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باشندہ (پادشاہ میر خان) نمی تھا جو امیر عبدالرحمٰن خان کا غلام بچہ تھا اور بعد میں جنگ استقلال افغانستان میں (1919ء میں) مرحوم سپہ سالار سردار محمد نادر خان کی فوج میں انگریزوں سے لڑا اور امیر امان اللہ خان کے زمانے میں ایک کمشنری کا کمشنر (حاکمِ اعلیٰ) بنا تھا۔ جب ہم کابل پہنچے تو مکتب حبیبیہ کے ہیڈ ماسٹر حافظ احمد دین تھے جو غالبًا سرگودھا کے رہنے والے تھے۔ شیخ محمد ابراہیم جو بمبئی کالج سے اقتصادیات کے بی اے آنرز تھے اور جن کو قبلہ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مدحوم نے خاص طور پر افغانستان بھیجا تھا، جغرافیہ پڑھاتے تھے اور مولوی محمد علی قصوری ایم اے کینٹب ریاضی کا سبق دیا کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان نے ایک ملٹری اسکول بھی قائم کیا جس کا ہیڈ ماسٹر خیری بیگ نامی ایک ترکی کیپٹن تھا۔ اس کے ساتھ دو تین اور ترکی افسر بھی تھے جو بغداد سے یہاں آئے تھے اور نسلی لحاظ سے عرب تھے اور عربی ملت پروری کے نمائندے مانے جاتے تھے، اس لئے ان کی خیری بیگ سے کچھ بنتی نہ تھی۔ ان عرب افسروں میں سے محمود سامی امیر حبیب اللہ خان اور ولی عہد شہزادہ عنایت اللہ معین السلطنۃ کے عتاب کا نشانہ بننے کے درجہ تک بداخلاق تھا۔ وہ ہمارے کابل پہنچنے کے دنوں میں مکتب حربیہ سے علیحدہ ہو چکا تھا، لیکن بعد میں امیر امان اللہ خان کے زمانے میں مکتب حربیہ کا مدیر بن گیا تھا۔

کابل میں اس زمانے میں علمی اور ثقافتی کاروائیوں کا مرکز سردار محمود بیگ طرزی پسر سردار غلام محمد خان طرزی تھے جو اس زمانے میں افغانستان کا واحد اخبار سراج الاخبار نکالا کرتے تھے۔ سردار محمود بیگ طرزی اپنے والد مرحوم سردار غلام محمد خان طرزی جو افغانستان کے ایک مشہور شاعر تھے اور امیر عبدالرحمن خان کے زمانے میں افغانستان چھوڑ کر ترکی چلے گئے تھے، کے ساتھ استانبول میں رہے، بعد میں دمشق چلے گئے، اس لئے ان کے نام کے ساتھ ''بیگ'' کا لقب لگایا جاتا تھا۔ انہوں نے دمشق ہی میں شادی کی۔ ان کے گھر میں عربی اور ترکی بھی بولی جاتی تھی۔ ان کی ایک صاحب زادی کی شادی ولد عہد سردار عنایت اللہ خان نائب السلطنۃ سے ہوئی تھی اور دوسری صاحب زادی ثریا کی شادی، جو بعد میں ملکہ بنیں، سردار امان اللہ خان عین الدولہ سے ہو چکی تھی۔ سراج الاخبار کے نکالنے میں سردار محمود بیگ طرزی کے ساتھ ان کے شاگرد عبدالہادی خان جو بعد میں امیر امان اللہ خان کے زمانے میں لندن اور قاہرہ میں افغانی سفیر بنا اور عبدالرحمٰن خان کام کیا کرتے تھے۔ اخبار ہفتہ وار اور باتصویر تھا اور ٹیپو گراف (Typograph) چھپتا تھا۔

شرابًا طہورا

مخدوم امیر احمد اپنے مقالہ کے صفحہ 115 پر لکھتے ہیں کہ" تذکرہ مخادیم کھہڑا" کے مصنف نے مخدوم عبدالخالقؒ کی ایک روایت بیان کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میاں نور محمد کلہوڑا کے لشکر نے پیر گوٹھ پر حملہ کیا اور مخدوم عبدالرحمٰن کھہڑا اور ان کی جماعت کے 208 افراد کو مسجد میں شہید کیا۔ ان شہداء میں سے ایک شخص سخت زخمی حالت میں تھا، جو علاج معالجہ کے بعد تندرست ہوگیا۔ جب تک زندہ تھا، اپنا نچلا ہونٹ چوستا رہتا تھا، یہاں تک کہ اُس سے خون جاری ہو جاتا تھا۔ جب اُس سے اس کی وجہ معلوم کی گئی تو اس نے بڑی حسرت بھرے انداز میں قسم کھا کر بیان کیا کہ میں سخت زخمی حالت میں ان شہداء کی لاشوں میں تھا، جنہیں جنت کی حوریں شرابًا طہورًا کے پیالے پلا رہی تھیں۔ ایک حور نے پیالہ میری طرف بڑھایا تو ان کے نگران فرشتے نے پکار کر کہا کہ خبردار! یہ شخص ابھی زندہ ہے۔ اسے شرابًا طہورا پلانے کا حکم نہیں۔ لیکن ان کے پیالے سے ایک قطرہ میرے نچلے ہونٹ پر چھلک پڑا، جس کی لذت اور حلاوت میں آج تک فراموش نہیں کرسکتا۔ اس لئے خود کو ہونٹ چوسنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ (سہ ماہی مہران سوانح نمبر 1957 سے شکریہ کے ساتھ)

© rasailojaraid.com